الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

عقل مند آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے
اور بیوقوف آدمی کرنے کے بعد ——

اکتوبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین رُوپے □ شمارہ ۸۳

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

اکتوبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۳

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

AL-RISALA

Islamic Monthly

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ انگریزی الرسالہ کے ٹائٹل کا نمونہ زیر نظر شمارہ کے آخری صفحہ پر دیا جارہا ہے۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

دوست کی خاطر

اگر آپ کسی سفر پر جانے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچیں اور وہاں اپنے دوستوں سے ملنے میں بہت زیادہ دیر لگا دیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی پرواز کھو دیں۔ آپ ملاقات کی سیٹ پر لمبی بات چیت میں مشغول ہوں اور ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت آجائے اور وہ آپ کو لئے بغیر اڑ جائے۔ لیکن اگر آپ کا "دوست"، ملک کا حکمراں ہو تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔

ہندستان کی حکمراں پارٹی کے دو ممبران پارلی منٹ مسٹر ارن نہرو اور مسٹر اودے سنگھ راؤ گائیکواڑ کیوبا گئے۔ وہاں ان کو کیوبا کی سالانہ تقریبات میں شرکت کرنا تھا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ اگست ۱۹۸۳) کی رپورٹ کے مطابق تقریبات کی تکمیل کے بعد انھوں نے چاہا کہ کیوبا کے صدر ڈاکٹر فیڈل کیسٹرو (Dr. Fidel Castro) سے ملاقات کریں۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں اپنی درخواست بھجوائی۔ دو دن کے انتظار کے بعد انھیں جواب ملا کہ صدر نے آپ دونوں کو آج رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ مگر ایم پی صاحبان نے محسوس کیا کہ وہ صدر کی اس عنایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کیوں کہ اسی دن شام کو ۵ بجے ان کا واپسی کا رزرویشن تھا۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں معذرت کا پیغام بھیج دیا اور اپنے پروگرام کے مطابق ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ لوگ ہوانا ایئرپورٹ پر تھے کہ اچانک ڈاکٹر کیسٹرو برآمد ہوئے۔ وہ اپنے "انڈین فرینڈس" سے ملنے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچے تھے۔ انھوں نے دونوں ہندستانی ایم پی سے پرجوش ملاقات کی اور وی آئی پی لاونج میں بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر کیسٹرو کے مترجم نے محسوس کیا کہ ایم پی صاحبان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ معزز صدر کی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اور گھڑی کے مطابق ہماری جہاز کی اڑان کا وقت ہو گیا ہے۔ مترجم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ مطمئن رہیں آپ کا جہاز اس وقت تک اڑان نہیں کرے گا جب تک ڈاکٹر کیسٹرو اس کو گرین سگنل نہ دے دیں:

Your plane will not take off until Dr. Castro gives the green signal.

ہوائی اڈہ کے ذمہ داروں کے علم میں اگر یہ بات آجائے کہ ملک کا حکمراں ہوائی اڈہ کے انتظار گاہ میں اپنے دوست مسافر سے بات کر رہا ہے تو وہ خود ہی ہوائی جہاز کو اس کے سوار ہونے تک روکے

رہیں گے۔ اس کے بعد حکمراں کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر اس کے لئے ہدایت نامہ جاری کرے۔

یہ معاملہ جس کا تجربہ ہندستان کے ایم پی صاحبان کو ایک ملک کے حکمراں کے بارے میں ہوا، یہی زیادہ بڑے پیمانے پر کائنات کے حکمراں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر آپ مالک کائنات کے کام میں لگے ہوئے ہوں۔ اگر زمین و آسمان کے بادشاہ سے آپ کی ملاقات جاری ہو تو آپ کا معاملہ عام معاملہ نہیں رہتا بلکہ خاص معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا میں مصروف ہونے کی وجہ سے جو کام آپ بطور خود نہ کر سکے وہ خدا کی دوسری مخلوقات آپ کی طرف سے انجام دے دیں گی۔ جہاں عام لوگوں کے کام بگڑتے ہیں وہاں آپ کے کام بن جائیں گے۔ جب لوگ مواقع کھو دیتے ہیں اس وقت مواقع خود انتظار کریں گے کہ آپ آئیں اور ان کو استعمال کریں۔

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ درمیان میں نماز کا وقت آگیا۔ لوگوں کی رائے ہوئی کہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ اگلے اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو پوری جماعت پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ کسی نے کہا کہ یہاں ٹرین صرف دو منٹ رکتی ہے۔ آپ لوگ نماز پڑھتے رہیں گے اور گاڑی چلی جائے گی۔ قافلہ کے امیر نے کہا کہ ہم اللہ کا کام کرنے جا رہے ہیں اور گاڑی بھی اللہ کی ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہم کو لئے بغیر آگے چلی جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں نے پورے اطمینان کے ساتھ پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کی۔ گاڑی کے انجن نے صرف اس وقت سیٹی دی جب کہ وہ لوگ نماز سے فارغ ہو کر اپنے ڈبہ میں واپس آچکے تھے۔

ایک ملک کے صدر کے دوستوں کے لئے اگر ہوائی جہاز رک سکتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہئے اگر خدا کے دوستوں کی خاطر زمین و آسمان کی گردشیں رک جائیں۔ بشرطیکہ زمین پر یہ واقعہ رونما ہو کہ خدا کے کچھ بندے خدا کو اپنا دوست اور اپنا کارساز بنالیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کیس کو خدا کا کیس نہیں بنایا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں قومی جذبات کے تحت کر رہے ہیں نہ کہ ربّانی جذبات کے تحت۔ ان کی تحریکیں اور ان کے لیڈروں کی سرگرمیاں بتاتی ہیں کہ ان کا کیس ابھی تک صرف مادی مفادات اور قومی مسائل کا کیس ہے۔ وہ خدا کے لئے نہیں بلکہ غیر خدا کے لئے سرگرم ہیں۔ ایسی حالت میں یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قوموں سے بچھڑ جائیں۔ ان کا "جہاز" ان کو ساتھ لئے بغیر اڑ جائے۔

فطرت کی خلاف ورزی

خنزیر کا لفظ اکثر زبانوں میں برا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خنزیر عام طور پر گندگی کھاتا ہے۔ اس بنا پر اس کے نام کے ساتھ گندگی کا تصوّر وابستہ ہو گیا۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

Pig turns man into a pig.

یعنی سور (کا گوشت) آدمی کو بھی سور بنا دیتا ہے۔ ویبسٹر ڈکشنری میں لفظ پگ (Pig) کا چوتھا مفہوم حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔

a person regarded as acting or looking like a pig., a greedy or a filthy person. (Clloq.)

یعنی سور جیسا آدمی، لالچی اور گندہ آدمی۔ فرانسیسی میں خنزیر کو کوشوں (couchon) کہتے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی زبان میں پگ سے بھی زیادہ برے معنی رکھتا ہے۔

خنزیر کو گندہ خوراک سے بچانے کے لئے موجودہ زمانہ میں اعلیٰ قسم کے بڑے بڑے فارم بنائے گئے ہیں۔ پگ کیپنگ (Pig-keeping) اب ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ پگ فارموں میں ان کے لئے خاص طور پر صاف ستھری غذاؤں کا انتظام کیا جاتا ہے اور دوسری سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

تاہم خنزیر کے فارم مغربی دنیا میں اب تنقید کا موضوع بن رہے ہیں۔ لندن کے اخبار گارجین (۲۹ مئی ۱۹۸۳) میں دو کالم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ کیا خنزیر ختم ہونے والے ہیں:

Are pigs doomed ?

مضمون نگار (Ralph Whitlock) نے دکھایا ہے کہ مغرب میں خنزیر کے جدید فارم اب دن بدن ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ خنزیر مضمون نگار کے الفاظ میں انسان کا مدّمقابل (Competitor) ہے۔ یعنی وہ وہی خوراک کھاتا ہے جو انسان کھاتا ہے۔ خنزیر نہ گھاس کھاتا ہے اور نہ گوشت۔ اس کو غلّہ کی بنی ہوئی چیزیں (ڈبل روٹی وغیرہ) کھلانی پڑتی ہیں۔ مزید یہ کہ خنزیر بہت پیٹو جانور ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ غذا کھاتا ہے۔ چند خنزیر اگر کسی بیکری میں داخل ہو جائیں تو وہ وہاں کی تمام ڈبل روٹی اور پنیر کھا کر ختم کر دیں گے۔

موجودہ زمانہ میں خنزیر کی خوراک میں کفایت کی خاص کوشش کی جا رہی ہے۔ خنزیر کے فارموں میں کمپیوٹروں کے ذریعہ ان کی خوراک پر کنٹرول کیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ کھا سکیں۔ مگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی خنزیر کا یہ حال ہے کہ اس کے لاشہ میں ایک پونڈ کا اضافہ کرنے کے لئے اس کو ۵ پونڈ خوراک کھلانی پڑتی ہے۔

Despite all modern aids to economic production, it still takes about 5 pounds of pig food to produce one pound of weight increase in the pig's carcase.

مضمون نگار کے الفاظ میں یہ خنزیر کی بنیادی کمزوری (Fundamental Weakness) ہے۔ بکری اور گائے گھاس کو گوشت میں تبدیل کرتے ہیں۔ گویا جس چیز کو انسانی معدہ براہ راست ہضم نہیں کرسکتا اس کو خود کھا کر دودھ اور گوشت کی صورت دیتے ہیں اور ہمارے لئے کھانے کے قابل بناتے ہیں۔ مگر خنزیر کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ خود انسان کی غذا (ڈبل روٹی وغیرہ) کھاتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ۵ پونڈ انسانی غذا کھا کر صرف ایک پونڈ گوشت انسان کو واپس کرتا ہے۔ خنزیر صرف یہ کرتا ہے کہ سستی خوراک کو مہنگی خوراک بنادے :

The pig can only translate a cheap food into an expensive one

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی کا انفجار ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایٹمی جنگ سے بھی زیادہ بڑا خطرہ ہے۔

The population explosion is a far greater threat than that of nuclear war.
tnan that of nuclear war.

زمین پر انسانی آبادی ہندسی نسبت (Geometrical Progression) سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق ۲۰۱۵ میں دنیا کی موجودہ آبادی دگنا ہوجائے گی۔ ایسی حالت میں خنزیر کا مستقبل، مضمون نگار کے نزدیک، اکیسویں صدی میں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی بہت تھوڑی تعداد کو چھاچھ اور ٹکڑوں کی خوراک مل سکے گی۔ اور بقیہ تمام خنزیر غذائی اشیاء کی قلت کے سبب دوبارہ گندگی کھانے والے جانور (Scavenger) بن کر رہ جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ خنزیر یا تو گندگی کھاتا ہے یا انسانی خوراک۔ خنزیر کو خدا نے اس لئے بنایا تھا کہ وہ گندگی کو اپنی خوراک بناکر "صفائی کرم چاری" کا کام انجام دے۔ مگر انسان نے اس کو اپنی خوراک بنالیا اور اس کی خاطر جدید طرز کے بڑے بڑے فارم بنائے۔ قدرت کے نظام میں یہ مداخلت صرف اس قیمت پر ہوئی کہ انسان اپنی خوراک کا زیادہ حصہ اس کو کھلا کر اس سے اپنے لئے کم خوراک حاصل کرے۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے وہ حد درجہ حکمت پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں کی جامع رعایت ہے۔ انسان کے لئے واحد درست راستہ یہ ہے کہ وہ قدرت کے نظام کی پیروی کرے۔ جب بھی وہ اس نظام کے بدلنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اس کے بعد ماحول میں کوئی نئی خرابی پیدا ہوجائے۔

جہاد کے نام پر

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں روہیل کھنڈ (شمالی ہند) میں روہیلہ خاندان کے نواب رحمت خاں کی حکومت تھی۔ یہ افغانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ہوش سے زیادہ جوش کے مالک تھے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کی مخالفت ہوگئی۔ کمپنی نے اودھ (لکھنؤ) کے نواب شجاع الدولہ کو نواب رحمت خاں سے لڑادیا۔ اس جنگ میں نواب شجاع الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد حاصل تھی چنانچہ ان کو کامیابی ہوئی اور ۱۷۷۴ میں میرن پور کٹرہ کی جنگ میں نواب رحمت خاں مارے گئے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نواب شجاع الدولہ کی حکومت اودھ اور روہیل کھنڈ (لکھنؤ سے لے کر بریلی) تک قائم ہوگئی۔ تاہم یہ حکومت صرف ۲۷ سال باقی رہی۔ ۱۸۰۱ء میں ادائیگی قرض کے نام پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے روہیل کھنڈ کو براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس زمانہ میں ایک مفتی محمد عیوض بدایونی تھے جو بریلی میں افتاء کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کا تقرر نواب رحمت خاں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ تاہم بعد کے زمانہ میں بھی وہ بدستور اپنے عہدہ پر باقی رہے۔ طویل خاندانی روایت کی وجہ سے عوام کے اندر ان کو بڑا ادب و احترام حاصل تھا۔ عوام کے علاوہ حکومت کے حلقے بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ اس دوطرفہ مقبولیت کو اگر وہ حکمت کے ساتھ استعمال کرتے تو وہ کوئی بڑا دینی کام کرسکتے تھے۔ مگر اس کو انھوں نے بے معنیٰ تصادم میں ضائع کردیا۔

۱۸۱۴ کا واقعہ ہے جب کہ روہیل کھنڈ میں انگریزی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ انھوں نے نظم ونسق کو مضبوط بنانے کے لئے ایک اقدام کیا۔ انھوں نے ایک قانون پاس کیا جو "چوکیداری ٹیکس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت بڑے بڑے شہروں میں پولیس کی تنظیم قائم کی جائے اور اس خرچ کو چوکیداری ٹیکس وصول کرکے پورا کیا جائے۔

چوکیداری ٹیکس کا قانون روہیل کھنڈ کے علاقہ کے دوسرے مقامات پر کسی احتجاج یا مزاحمت کے بغیر نافذ ہوگیا۔ لیکن بریلی میں صورت حال برعکس تھی۔ بریلی نوابی دور سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں سابق نواب رحمت خاں کے بچے ہوئے افراد خاندان موجود تھے۔ انھوں نے چوکیداری ٹیکس کو بہانہ بنایا اور اس کے نام پر انگریزی حکومت کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ میں مفتی محمد عیوض نے ان کا پورا ساتھ دیا۔

اب سیاست اور مذہب دونوں ایک ہوگئے۔ مفتی محمد عیوض نے فتویٰ دیا کہ چوکیداری ٹیکس

سراسر ناجائز ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے اوپر جزیہ لگانے کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے مسلم عوام اس ٹیکس کے خلاف ہو گئے۔ خاص طور پر افغانی پٹھان بڑی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جو پہلے سے انگریزوں سے بگڑے ہوئے تھے، کیونکہ انگریزوں نے ان کی افغان حکومت کو اس علاقہ سے ختم کیا تھا۔

مفتی محمد عیوض کے فتوے کے بعد مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات ابھر آئے۔ شہر بریلی میں زبردست ہڑتال کی گئی۔

مسٹر ڈمبلٹن اس وقت یہاں ضلع مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ڈمبلٹن نے چوکیداری ٹیکس کی وصولی کے لیے ۱۶ اپریل ۱۸۱۶ء کی قطعی تاریخ مقرر کر دی اور اس کا اعلان کرا دیا۔ جب یہ تاریخ آئی تو بریلی کے مسلم عوام بڑی تعداد میں مفتی محمد عیوض کے مکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ مفتی صاحب نے اس مجمع کی قیادت سنبھال لی۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی طرف آ رہا ہے۔ انھوں نے عوام کو ہدایت کی کہ انگریز مجسٹریٹ کو آگے بڑھنے سے روکیں اور اس کو یہاں نہ آنے دیں۔ اس کے بعد جو ہونے والا تھا وہی ہوا۔ انگریز مجسٹریٹ نے بھی آگے بڑھنے پر اصرار کیا جس کی وجہ سے انگریزی پولیس اور مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے درمیان تصادم ہو گیا۔ اس کا نقصان مفتی محمد عیوض اور ان کے حامیوں کو پہنچا کیوں کہ ان کے پاس لاٹھی ڈنڈے کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا جب کہ انگریز پولیس بندوقوں سے مسلح تھی۔ اس نے مجمع پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں بہت سے افراد ہلاک ہو گئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔

تاہم مفتی محمد عیوض نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے حسینی باغ (بریلی) میں مسلمانوں کو جمع کیا اور یہاں پر جوشش تقریر کرتے ہوئے جہاد کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی حکومت سے اسلام کو خطرہ ہے۔ اس لئے اس سے لڑنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اطراف کے علاقوں سے بھی لوگ آنے لگے اور چند دن کے اندر تقریباً پانچ ہزار روہیلہ پٹھان تلواروں اور آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مفتی محمد عیوض کی سرداری میں جمع ہو گئے۔

انگریزوں نے مصالحت دکھائی اور گفت و شنید سے مسئلہ کو حل کرنا چاہا۔ مگر مفتی محمد عیوض صاحب جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف بریلی، رامپور، پیلی بھیت، بجنور، بدایوں، شاہجہاں پور تک کے پٹھان جہاد کا اعلان سن کر آتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً ۱۵ ہزار ہو گئی۔

مفتی محمد عیوض کے حوصلے اب بہت بڑھ گئے۔ انھوں نے صلح کے لئے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے مندرجہ ذیل چار شرطیں پیش کیں۔

۱ چوکیداری ٹیکس کو منسوخ کیا جائے۔

۲ بریلی کے انگریز کوتوال کو ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ ہم اس کے اوپر شرعی سزا نافذ کریں۔
۳ پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کے وارثین کو معقول معاوضہ دیا جائے۔
۴ چوکیداری ٹیکس کے تمام مظاہرین کی عام معافی کا اعلان کیا جائے۔

انگریز حکومت تمام شرطوں کو مان سکتی تھی۔ مگر وہ دوسری شرط کو کسی قیمت پر نہیں مان سکتی تھی۔ دوسری طرف مفتی محمد عیوض کے حامیوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ گفت وشنید کے دوران بھی وہ پرامن نہ رہے۔ عین اس زمانہ میں ان میں سے کچھ لوگوں نے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کولیسٹر کے لڑکے کو قتل کر دیا۔ بالآخر انگریز سپاہیوں کی بڑی تعداد نے ۱۸ اپریل ۱۸۱۶ کو مفتی محمد عیوض کے حامیوں پر حملہ کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی مگر انگریزی بندوقوں کے مقابلہ میں روہیلے افغانوں کے روایتی ہتھیاروں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سو روہیلے جان سے مارے گئے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔

اس کے بعد روہیلے افغانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مفتی محمد عیوض کا تیاری کے بغیر جہاد ایک ہی دن کے مقابلہ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مفتی محمد عیوض بریلی چھوڑ کر رامپور چلے گئے جہاں صرف ایک سال میں ان کا انتقال ہو گیا ——— چوکیداری ٹیکس کو برداشت نہ کرنے والا بالآخر ملت کو اس سے بہت زیادہ بڑی بربادی کے حوالے کر کے اس دنیا سے چلا گیا۔

اس قسم کی بے معنی لڑائیاں جو ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ملت کے اندر جاری ہیں وہ ہرگز جہاد نہیں ہیں۔ یہ جہاد کے نام پر اپنے جان و مال کو ضائع کرنا ہے۔

جہاد دراصل اللہ کی راہ میں کوشش کرنا ہے۔ اور اللہ کا کام دعوت الی اللہ ہے۔ اہل ایمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ممکن قوتوں کو دعوت الی اللہ کے میدان میں لگائیں۔ وہ دوسری قوموں کو ہدایت خداوندی کے راستہ پر لانے کی کوشش کریں۔ یہی اہل ایمان کا اصل جہاد ہے۔

مسلمانوں کو اس اصل جہاد کا صحیح احساس نہیں۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کو اپنے لئے حرام سمجھ لیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی غیر متعلق باتوں میں الجھنے سے داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ختم ہوتی ہے اور معتدل فضا کے بغیر کسی کو کوئی دعوت نہیں دی جا سکتی۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ چھوٹی چھوٹی ناخوشگواریوں کو برداشت کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ یقینی طور پر خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مدعو اقوام سے لڑ پڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں ان کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ یہ یقینی طور پر نفسانیت ہے نہ کہ خدائی جہاد۔

دوبارہ زمین پر

۲۸ فروری ۱۹۸۲ کو مجھ پر ایک انوکھا تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنے جسم سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں چلا گیا تھا۔ پھر دوبارہ میں زمین پر واپس آیا۔ یہ تجربہ ایسا انوکھا تجربہ تھا جس کو انسانی لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس کی ظاہری کہانی کو کسی حد تک ضرور بیان کیا جا سکتا ہے۔

نئی دہلی (کرزن روڈ) پر راقم الحروف کا ماہانہ درس قرآن ہوتا ہے۔ اس کا سلسلہ اولاً ۲۹ جون ۱۹۸۰ کو شروع ہوا تھا۔ یہ درس پابندی کے ساتھ جاری ہے اور اس کا وقت ہر مہینہ کے آخری اتوار کو بعد نماز مغرب ہے۔

۲۸ فروری کو اسی قسم کے درس کا دن تھا۔ میں حسب معمول اپنے گھر سے کرزن روڈ گیا۔ اور مغرب بعد قرآن کا درس دیا۔ یہ درس وہی تھا جو بعد کو تفصیلی صورت میں تحریر ہو کر احیاء اسلام نامی کتاب میں "احیاء اسلام" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس روز دہلی میں بارش ہوئی تھی۔ سڑکوں پر جگہ جگہ پانی تھا۔ رات کے تقریباً ۹ بجے تھے۔ میں حسب معمول درس قرآن سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ساتھیوں نے روکا کہ آج رات کو یہیں رہ جائیں۔ اور صبح کو یہاں سے جائیں۔ آپ کے گھر پر ٹیلی فون سے مطلع کر دیا جائے گا۔ مگر میں بارش کی پروا کئے بغیر ان سے معذرت کر کے نکل پڑا۔ سڑک پر پہنچا تو کوئی سواری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں آگے چلتا رہا کہ جہاں کوئی سواری ملے گی اس کو پکڑ لوں گا۔ مگر اتفاق سے کوئی سواری دکھائی نہ دی۔ اتوار اور بارش کی وجہ سے سڑکوں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں اس وقت تنہا تھا۔ کرزن روڈ سے گزر کر میں کناٹ پلیس کے علاقہ میں آیا۔ اس کے بعد پیدل چلتے ہوئے اس سڑک پر پہنچا جس کو منٹو روڈ کہا جاتا ہے۔ میں ہلکی بارش میں بھیگتا ہوا برابر چل رہا تھا۔ اس وقت طبیعت میں نامعلوم طور پر ایک عجیب سرور تھا۔ یہ سفر میرے لئے ایک قسم کا روحانی سفر بن گیا جس نے موسم کی نامساعدت کو میرے لئے غیر اہم بنا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں خدا کے فیضان میں نہاتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ تنہائی کے باوجود مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی عظیم قوت میرے ساتھ ہے۔ کوئی اپنی خصوصی رحمتوں کے ساتھ مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے

ہے۔ مجھے اس وقت نہ تکان کا احساس تھا اور نہ بھیگنے کا۔ مجھ کو نہ رات کا سناٹا ستا رہا تھا اور نہ تنہا پیدل سفر کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مجھے نامعلوم طور پر کسی خاص منزل کی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔

میں چلتے چلتے ریلوے پل اور اجمیری گیٹ کے درمیان پہنچا۔ یہاں میرے بائیں طرف بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ اس کھمبے کے نچلے حصہ میں بائیں طرف بجلی کے تاروں کا وہ مشترکہ خانہ تھا جس کو جنکشن باکس (Junction Box) کہا جاتا ہے۔ جنکشن باکس کا ڈھکن غائب تھا اور وہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ اگرچہ سڑک پوری خالی تھی۔ مگر میں اپنی عادت کے مطابق بالکل کنارے پر چل رہا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچ کر اس کے بائیں طرف مجھے پانی نظر آیا۔ میں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ بارش کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ اس قسم کا معمولی پانی تھا اور میں برابر ان سے گزر رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ ایک دو انچ سے زیادہ گہرا نہیں ہوگا اور تیزی سے چلتے ہوئے اس پانی پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ مگر وہ کمر برابر گہرا گڑھا تھا۔ اچانک میں اس میں گر پڑا۔ اب میرا جسم گڑھے کے اندر تھا اور میرا دایاں ہاتھ جنکشن باکس میں۔

فی الفور بجلی نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ پکڑ ہتھیلی اور کلائی کے درمیان تھی۔ ایک لمحہ میں میرا سارا جسم بالکل بے حرکت ہو گیا۔ میرا دایاں ہاتھ بجلی کے تاروں کے گچھے پر تھا۔ اور بقیہ جسم بے حس و حرکت ہو کر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا کہ میں بجلی کے سمندر میں نہا رہا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یا تو فوراً مر جاتا ہے یا گھبراہٹ میں کچھ چیخیں نکال کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ مگر بجلی کے حادثات کی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ جس وقت مجھے بجلی پکڑے ہوئے تھی اس وقت بھی میں ہوش میں تھا۔ بظاہر اگرچہ میں مر چکا تھا مگر میرا ذہن اب بھی پوری طرح حاضر تھا۔ میں تمام باتوں سے اسی طرح باخبر تھا جس طرح میں عام حالت میں باخبر رہتا۔ شاید یہ کوئی مطلوب منزل تھی۔ شاید میں وہیں پہنچ گیا تھا جس کی طرف ہنکا کر مجھ کو لایا جا رہا تھا۔

یہ حالت میرے خیال کے مطابق پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ یہ ذہن اور جسم کی علیحدگی کا ایک لمحہ تھا۔ میں اپنے جسم سے اوپر اٹھ کر واقعات کو دیکھ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کرنٹ کا ایک بے حد تیز رفتار دھارا ہے جو میرے جسم کے اندر موجیں مار رہا ہے۔ میرے بھائی بجلی کے انجینئر ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی یہ بات مجھے یاد تھی کہ اگر میں اپنے دوسرے

ہاتھ کو اٹھا کر زور سے پہلے ہاتھ پر ماروں تو وہ چھوٹ جائے گا۔ مگر اس وقت میں ایسا کرنے پر قادر نہ تھا۔ کیونکہ سارے جسم کی طرح اس وقت میرا دوسرا ہاتھ بھی بالکل بے حرکت تھا۔

میرا ذہن اس وقت بالکل معتدل حالت میں تھا اور میں کسی گھبراہٹ کے بغیر مختلف قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب میں موت کے بالکل آخری کنارے پر پہنچ چکا ہوں۔ شاید اگلے چند لمحے کے اندر میں موجودہ دنیا سے گزر کر دوسری دنیا میں داخل ہو جاؤں گا۔ اگرچہ میں آخرت کو نہیں دیکھ رہا تھا مگر یہ احساس مجھ پر ضرور طاری تھا کہ میرے اور آخرت کے درمیان اب ایک قدم سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی مرکز کے پہلے اجتماع (بھوپال، ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) کا اعلان الرسالہ میں شائع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس وقت میرے ذہن میں بار بار یہ بات آرہی تھی کہ اعلان کے مطابق بہت سے اللہ کے بندے مذکورہ تاریخ کو بھوپال آئیں گے۔ اور میری موت کی خبر سن کر واپس چلے جائیں گے۔ یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ میں نے قرآن کی ایک تذکیری تفسیر شروع کی تھی، اب وہ شاید ہمیشہ کے لئے ناتمام رہ جائے گی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے ایک مشن شروع کیا تھا مگر میں اس مشن کی تکمیل سے پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔ یہ یاد بھی آتی تھی کہ اس وقت میری جیب میں ایسا کوئی کاغذ نہیں جس میں میرا نام و پتہ لکھا ہوا ہو، اور یہ علاقہ سب غیر مسلموں کا ہے، وہ لوگ کیسے مجھے پہچانیں گے کہ میں کون ہوں۔ پھر اپنی بے بسی کی طرف خیال جاتا تھا کہ انسان کس قدر بے بس ہے، اس وقت بھی میں پورے شعور کے ساتھ زندہ موجود تھا۔ مگر میرے جسم کے اوپر سے میرا کنٹرول بالکل ختم ہو چکا تھا۔

تاہم سارے جسم میں ایک استثناء تھا۔ اور وہ زبان کا تھا۔ میرا جسم اگرچہ پورا کا پورا بے حرکت تھا۔ مگر زبان حیرت انگیز طور پر حرکت میں تھی۔ وہ برابر بالکل معتدل انداز میں یَا اَللّٰہ، یَا اَللّٰہ کہے جا رہی تھی۔ میری زبان اس وقت یا اللہ کہہ رہی تھی اور میرا ذہن بے بسی کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ اب میں کس طرح اس سے بچ سکتا ہوں۔

مگر ۵ منٹ گذرے تھے کہ اچانک نامعلوم طور پر بجلی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میرا ہاتھ تاروں سے الگ ہو کر جنکشن باکس کے باہر آگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا اب تک میں کسی اور عالم میں تھا، اب دوبارہ اپنی سابقہ دنیا میں واپس آگیا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو پانی کے گڑھے

سے باہر نکالا اور قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ کلائی سے لیکر ہتھیلی تک گہرا جل چکا تھا۔ مگر میرا دل حیرت انگیز طور پر اس وقت بھی بے حد پر سکون تھا۔

اتنے میں کچھ مقامی غیر مسلم صاحبان وہاں آ گئے۔ انہوں نے مجھ کو اٹھایا اور سہارا دے کر مجھ کو قریب کے مکان میں لے گئے۔ اس وقت حال یہ تھا کہ میرے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک میں پانی سے تر تھا اور میرے جسم سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اب میں پیدل چل کر گھر پہنچنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرے گھر پر ٹیلیفون کر کے مطلع کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں ہم میں سے کسی کے پاس ٹیلیفون نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ میرے لئے کوئی سواری بلا دیں۔ وہ لوگ اس کے لئے آمادہ ہو گئے اور ڈھونڈھ کر کہیں سے ایک سائیکل رکشا لے آئے۔ میں اس پر تنہا سوار ہو کر اپنے گھر آ گیا۔ وہ لوگ رکشہ کا کرایہ دینے لگے۔ میں نے منع کیا کہ اس کی ضرورت نہیں، میں خود ادا کر دوں گا۔

میں گھر پہنچا تو میرے سارے کپڑے پانی میں تر تھے اور مجھے کپکپی ہو رہی تھی۔ فوری طور پر کپڑا بدلنا ضروری تھا مگر الکٹرک برن اور فریکچر کی وجہ سے میرا دایاں ہاتھ سیدھا لٹک رہا تھا اور میں اس کو اٹھانے پر قادر نہ تھا۔ چنانچہ اوپر کا کوٹ تو کسی طرح سالم اتارا گیا اور بقیہ کپڑے قینچی سے کاٹ کر میرے جسم سے الگ کئے گئے۔ ایک بنیان اور ایک سوئٹر کٹا ہوا اب بھی میری الماری میں بطور یادگار موجود ہے۔

میرے لڑکے ثانی اثنین خان نے ٹیلیفون کر کے جناب اطہر صدیقی صاحب اور جناب محمد شمیم صاحب کو صورت حال کی خبر دی۔ وہ لوگ فوراً آ گئے۔ اور رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے مجھے ھمدرد نرسنگ ہوم (نئی دہلی) پہنچا دیا گیا۔ وہاں اگرچہ مجھے ایک خصوصی کمرہ نمبر ۶ دیا گیا تھا، تاہم نرسنگ ہوم کے صدر حکیم عبدالحمید صاحب نے نرسنگ ہوم کے انتظامی انچارج سے یہ کہدیا تھا کہ "مولانا جب تک چاہیں یہاں رہیں، ان سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔" یہ بات انتظامی افسر نے آخری دن اس وقت بتائی جبکہ ہمارا آدمی حساب دینے کے لئے ان کے دفتر میں گیا۔

یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو نہ کبھی میرے ساتھ گزرا اور نہ کسی اور کے بارہ میں اب تک سننے یا پڑھنے میں آیا۔ بجلی کی مکمل گرفت میں آنے کے باوجود زندہ رہنا۔ جسم اور روح کا الگ ہو کر پھر مل جانا، حادثہ کے دوران جسم کے مکمل طور پر بے حرکت ہو جانے کے باوجود ذہن کا مکمل طور پر

حاضر رہنا، پھر نہایت پر سکون رہ کر یا اللہ یا اللہ کرتے رہنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ عام معنوں میں محض ایک حادثہ نہ تھا بلکہ ایک تجربہ تھا۔ گویا کہ انسان کی کامل بے اختیاری کو مجھے اپنی آنکھوں سے دکھایا گیا۔ میں نے انسان کی اس ہستی کو دریافت کیا جو مادی قوانین کے پرے ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے گویا اس خدا کو براہ راست دیکھا جو قادر مطلق ہے۔ بجلی کا سوئچ دنیا میں خواہ بند نہ ہو مگر وہ اوپر سے اس کو بند کر سکتا ہے۔ شاید بجلی کے حادثات کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنے کامل طور پر بجلی کی گرفت میں آجانے کے باوجود میں موت سے بچ کر نکل آیا۔ اس دوران مجھ کو جو لطیف تجربات ہوئے اس کے اعتبار سے دیکھئے تو گویا کہ میں روحانی دنیا میں جاکر مادی دنیا میں واپس آگیا۔ میں آسمان کے اوپر پہنچ کر دوبارہ زمین کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے انسان کے فانی وجود کے اندر ایک باقی وجود کا تجربہ کیا۔

۲۸ فروری کی شام سے لیکر ۵ مارچ ۱۹۸۲ کی شام تک میں ہمدرد نرسنگ ہوم میں رہا۔ اسپتال کی زندگی کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میرے گھر والوں کے لئے بھی یہ نئی افتاد تھی۔ میرے لڑکے ثانی اثنین خان کا پہلے دن یہ حال تھا کہ وہ میرے کمرہ کے تخت پر ساری رات سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ٹھنڈ کے باوجود بستر پر لیٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

اسپتال خواہ کتنا اچھا اور صاف ستھرا ہو، بہر حال وہ مریضوں اور آفت زدہ لوگوں کی دنیا ہے۔ میں اپنے علحدہ کمرے میں اگرچہ دوسرے مریضوں سے بالکل دور تھا۔ مگر خود یہ تصور میرے لئے وحشت ناک تھا کہ "میں اسپتال میں ہوں"۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مشکل سے کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جب کہ میں نے شوق سے کچھ کھایا پیا ہو۔ جناب رام رتن کپلا (KAPSONS) ازراہ عنایت روزانہ گائے کا خالص دودھ اور تازہ گھی اہتمام کے ساتھ بھیجتے تھے۔ مگر ان کو بھی استعمال کرنے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

نرسنگ ہوم میں روزانہ کئی ڈاکٹر مجھ کو دیکھنے آتے تھے۔ صبح و شام دوائیں کھلائی جاتی تھیں۔ اور دونوں وقت زخم کی صفائی اور ڈریسنگ ہوتی تھی۔ مگر تمام تر توجہ کے باوجود یہاں کے علاج سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عزیز (ایف آر سی ایس) نے گریفٹنگ کا مشورہ دیا مگر میں اس کے لئے راضی نہ ہوا۔ ڈریسنگ سے صرف یہ ہوا کہ زخم کے مردہ خلیات (Dead Cells) نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آئی کہ زخم اتنا گہرا ہو گیا کہ اندر کی رگیں نظر آنے لگیں۔

میری انگلیاں بڑی حد تک سن ہو چکی تھیں - اعصاب کی نسیں جل گئی تھیں جس کا یہ نتیجہ تھا کہ دائیں ہاتھ کا انگوٹھہ اور اس سے ملی ہوئی شہادت کی انگلی قلم پکڑنے کی طاقت کھو چکی تھیں - میں قلم ہاتھ میں لے کر لکھنے کی کوشش کرتا تو انگلیوں کی پکڑ اتنی کمزور رہتی کہ قلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتا۔ اپنا یہ حال دیکھ کر اکثر میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکل پڑتے اور زبان پر یہ الفاظ آجاتے۔
"یہ انگلیاں کیا دوبارہ قلم نہ پکڑ سکیں گی"

اسی درمیان میں مسٹر جان محمد بٹ (انگریز نو مسلم) انگلینڈ سے آئے اور ۲ مارچ کی شام کو مجھ سے نرسنگ ہوم میں ملے - انہوں نے مجھے ایک قلم ہدیتہً پیش کیا جو وہ انگلینڈ سے خرید کر میرے لئے لائے تھے - قلم کے بارہ میں انہیں میرے ذوق کا علم تھا - انہوں نے لندن میں میری پسند کا قلم تلاش کیا مگر وہاں ان کو نہیں ملا - پھر انہوں نے اکسفورڈ سے ایک قلم خریدا - یہ مانٹ بلانک (Mont Blanc) تھا جو جرمن کمپنی تیار کرتی ہے -

اس وقت مسٹر محمد اطہر صدیقی نرسنگ ہوم میں میرے کمرہ میں موجود تھے - انہوں نے جان محمد صاحب سے اچانک ایک سوال کیا - "یہ قلم آپ نے وہاں کس روز خریدا" انہوں نے بتایا کہ سنیچر کے روز - اس کے بعد اطہر صدیقی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھئے، یہ حادثہ آپ کو اتوار کی شام کو دہلی میں پیش آیا - اور اس سے ایک دن پہلے سنیچر کو خدا آپ کے لئے انگلینڈ میں قلم خرید وا رہا تھا - یہ اس بات کا شگون ہے کہ علم خداوندی میں یہ مقدر ہے کہ آپ کی انگلیاں دوبارہ ٹھیک ہوں - اور وہ دوبارہ اسی طرح قلم پکڑیں جس طرح وہ پہلے قلم پکڑتی تھیں -

یہ بات یقینی طور پر میرے لئے بہت خوش کن تھی - مگر اس وقت میری انگلیوں ما خاص طور پر انگوٹھہ کی حالت ایسی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ موصوف شاید میری تسلی کی خاطر ایسا کہہ رہے ہیں - اس زمانہ میں میرا حال یہ تھا کہ میں کسی کو کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھتا اور اس کے انگوٹھہ کی پکڑ پر نگاہ جاتی تو اس کے اوپر مجھ کو عجیب قسم کا رشک آتا - اس کی خوش قسمتی اور اپنی بے بسی کو سوچ کر دل کی عجیب حالت ہو جاتی -

اسی دوران ایک روز ایسا ہوا کہ اچانک مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا - ایک لمحہ کے اندر ایک کتاب (God Arises) کی پوری تھیم میرے ذہن میں آگئی - جبکہ ابھی میرا ہاتھ لکھنے کے قابل نہیں ہوا تھا - یہ تجربہ میں نے اپنی ڈائری کے صفحہ ۵۴ پر اپنے اسی ہاتھ سے لکھا - اس

تحریر کا عکس یہاں دیا جا رہا ہے۔ اس کو دیکھئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی انسانی تحریر نہ ہو بلکہ کوئی چڑیا کاغذ پر چلی ہو اور اس کے چلنے سے کاغذ پر نشانات بن گئے ہوں :

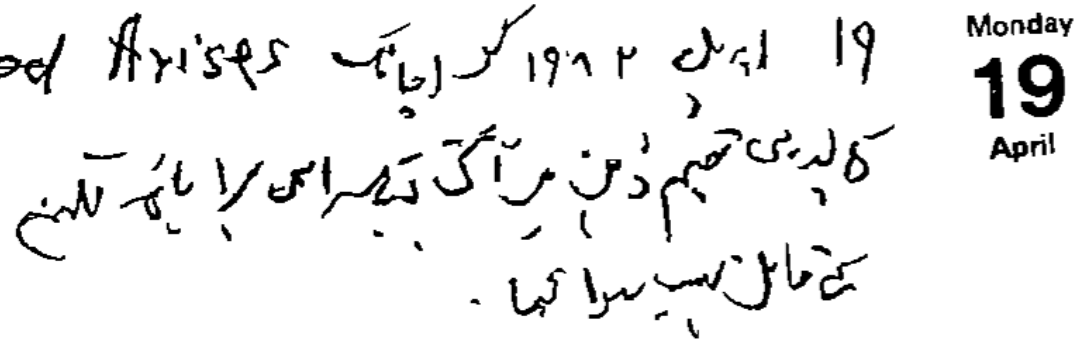

ایسے وقت میں ایک نئی کتاب کی تھیم ذہن میں آنا گویا خدائی اشارہ تھا کہ ابھی میری مدت کار ختم نہیں ہوئی۔ ابھی مجھ کو مزید لکھنے کی توفیق ملے گی۔

میں ۲۸ فروری ۱۹۸۲ کی شام کو ہمدرد نرسنگ ہوم (نئی دہلی) میں داخل ہوا اور ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ کی شام کو وہاں سے ڈسچارج ہو کر واپس اپنے مکان پر آیا۔ وہاں اکسرے کے ذریعہ معلوم ہوا کہ میرے داہنے شانہ پر فریکچر ہے۔ گڑھے میں میں اسی کے بل گرا تھا۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں میری کیفیت یہ تھی کہ میرا داہنا ہاتھ شانے سے لیکر انگلیوں تک تقریباً بیکار ہو رہا تھا۔ میں اس ہاتھ سے اپنا کمر بند بھی نہیں باندھ سکتا تھا اور نہ کرتا پہن سکتا تھا۔ نماز بھی بستر پر لیٹے لیٹے پڑھتا تھا۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں روزانہ میرے فریکچر پر اور ہاتھ کے زخم پر پٹی کی جاتی تھی اور انٹی بایوٹک دوائیں کھلائی جاتی تھیں، اسی حال میں صبح و شام گزر رہے تھے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ عیادت کی غرض سے آنے والے لوگ نرسنگ ہوم میں میرے کمرہ میں جمع تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ کا یہ حادثہ حکومت کی غفلت سے ہوا ہے۔ سڑک کے محکمہ نے سڑک کے کنارے گڑھا کھودا اور اس کو بھرے بغیر چھوڑ دیا۔ بجلی کے محکمہ نے بجلی کے کھمبے کے جنکشن باکس پر ڈھکن نہیں لگایا۔ آپ حکومت میں اپنے لئے معاوضہ کی درخواست دیدیں۔ حکومت میں بعض بڑے عہدیدار آپ کے قدردان ہیں اور آپ کی تحریریں نہایت پابندی سے پڑھتے ہیں۔ وہ آپ کی سفارش کر دیں گے اور آپ کے لئے معقول رقم منظور ہو جائے گی۔ میں اس وقت چپ رہا۔ جب وہ لوگ چلے گئے اور مجھے تنہائی ہوئی تو میں نے سوچا کہ اس قسم کی تجویز پیش کرنے والے شاید اس بات سے مایوس ہو چکے ہیں کہ میرا ہاتھ دوبارہ پہلی حالت کی طرف واپس آئے۔ اس لئے وہ اس طرح کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ مگر کیا میں بھی اس کو تسلیم کر کے معاوضہ کی درخواست پیش کر دوں۔ یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور میں نے کہا کہ خدایا اگر وہ لوگ ایک کرور

روپیہ بھی دیں تو مجھے منظور نہیں ہے ۔ مجھے تو اپنی وہ انگلیاں چاہئیں جن سے میں دوبارہ قلم پکڑوں اور آپ کے دین کی خدمت کروں ۔ انسان کی دی ہوئی کوئی بھی رقم میرے اس ہاتھ کی قیمت نہیں ہو سکتی جو آپ نے مجھے دیا تھا ۔

ہمدرد نرسنگ ہوم میں ایک ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب تھے ۔ وہ کافی تجربہ کار ڈاکٹر تھے ۔ انہوں نے ایک روز انگریزی کی یہ مثل سنائی :

Burns never return

یعنی جلا ہوا کبھی نہیں لوٹتا ۔ ان ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ میرے ہاتھ کی انگلیوں (خاص طور پر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی) کے اعصاب جل چکے ہیں اور اب وہ دوبارہ بننے والے نہیں ۔ اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اب بھی اگر میں قلم کا کام جاری رکھنا چاہتا ہوں تو بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق شروع کر دوں ۔ ایک نوجوان ڈاکٹر اتنے مہربان تھے کہ وہ قلم اور کاغذ لے کر آتے اور مجھ سے بائیں ہاتھ سے لکھواتے ۔ مگر اس وقت میرے جذبات کیا تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہیں دنوں میں نے اپنی ڈائری میں اپنے کمزور ہاتھوں سے یہ الفاظ لکھے " انشاء اللہ مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملہ میں اس قسم کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کرے گا ۔ یہ عبارت میں اپنے گھر پر ۷ مارچ ۱۹۸۲ کو لکھ رہا ہوں جب کہ قلم ابھی انگلیوں کی پوری گرفت میں نہیں ہے ۔ "

نرسنگ ہوم کے علاج سے تقریباً مایوس ہو کر میں ۵ مارچ ۱۹۸۲ کی شام کو اپنے گھر واپس آگیا ۔ اب ڈریسنگ اور اینٹی بایوٹک دواؤں کا وہی سلسلہ گھر پر جاری تھا جو اس سے پہلے نرسنگ ہوم میں چل رہا تھا ۔ ڈاکٹر اختر صدیقی از راہ عنایت خود میرے گھر پر آکر ڈریسنگ کرتے رہے ۔ تاہم ڈریسنگ سے صرف یہ ہو رہا تھا کہ زخم کے مردہ خلیات نکل رہے تھے اور زخم زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آتا جا رہا تھا ۔ حتیٰ کہ ایک روز جب پٹی کھولی گئی اور صفائی کی گئی تو وتر (Tendon) صاف دکھائی دینے لگا ۔ اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی ۔ گرم گرم آنسوؤں نے آنکھوں سے نکل کر بتایا کہ اس کیفیت کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں ہیں ۔

گھر آنے کے بعد ۶ مارچ کی شام کو میرے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ ریسیور اٹھایا تو میرے بڑے لڑکے ظفرالاسلام خاں لندن سے بول رہے تھے ۔ انہوں نے میرا حال دریافت کیا تو میں نے کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں کوئی پریشانی کی ضرورت نہیں ۔ مگر یہ کہتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ۔ ظفرالاسلام خاں کو پریشانی سے بچانے کے لئے اگرچہ میں یہ الفاظ بول رہا تھا مگر

حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اگرچہ اب بھی میں خدا سے بہتر امید لگائے ہوئے تھا مگر عملی صورت حال یہ تھی کہ بظاہر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ میری انگلیاں دوبارہ اس قابل ہو جائیں گی کہ وہ پہلے کی طرح کام کر سکیں۔

میری ڈائری میں ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ کی تاریخ کے ساتھ حسب ذیل الفاظ درج ہیں۔

"بجلی کے حادثہ کو آج ۱۰ دن ہو گئے۔ مگر کلائی پر ابھی تک گہرا زخم ہے اور میری انگلیاں ابھی بڑی حد تک سن ہیں اور کمزور ہیں۔ وہ قلم پکڑنے کے قابل نہیں (یہ سطریں ۱۰ مارچ کی صبح کو میں خود بمشکل لکھ رہا ہوں)

۱۰ مارچ کی شام کو طبیعت پر بڑا اثر تھا "کیا میری انگلیاں اب دوبارہ پہلے کی طرح قلم پکڑنے کے قابل نہ ہوں گی۔" وہ انگلیاں جن سے میں فیضان خداوندی کو کاغذ پر مرتسم کرتا تھا، کیا اب پھر متحرک نہ ہوں گی۔ رات کو نماز عشاء کے بعد میں نے دعا کی کہ خدایا صبح تک کوئی ایسی واضح علامت ظاہر کر دے جس سے مجھے اعتماد ہو جائے کہ میری انگلیاں دوبارہ پہلے کی طرح درست ہو جائیں گی چنانچہ رات کو دو خواب دیکھے۔ پہلا خواب جس کی تفصیل اچھی طرح یاد نہیں یہ تھا کہ میرے ہاتھ کو پوری طرح درست ہونے میں بہ دن لگیں گے۔ یہ خواب اگرچہ پوری طرح یاد نہیں تاہم "بہ دن" کا لفظ بخوبی یاد ہے۔

دوسرا خواب بہت صاف تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ یہ کہ میں کنوئیں پر ہوں اور پانی سے بھرا ہوا گھڑا دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر نکال رہا ہوں۔ کنواں کافی بڑا اور پرانا سا ہے۔ اس کے دونوں طرف تھونی گاڑ کر اس کے اوپر ایک لمبی لکڑی رکھی ہوئی ہے۔ اس لکڑی کے بیچ میں ایک پہیہ ہے۔ اس پہیہ کے اوپر سے رسی ڈال کر ڈول کنوئیں میں ڈالی جاتی ہے۔ ڈول کافی وزنی ہے۔ اس لیے میں اس کو مشکل سے کھینچ رہا ہوں۔ مگر یہ مشکل ڈول کے غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے ہے، ورنہ میرے ہاتھ کی پکڑ میں کوئی کمی نہیں۔ میرا ہاتھ اس کو اسی طرح پکڑے ہوئے ہے جس طرح حادثہ سے پہلے تندرستی کی حالت میں پکڑتا۔ انگلیوں میں یا کلائی میں کسی قسم کی کمزوری کا احساس نہیں۔ اس کے دو دن بعد پھر خواب دیکھا کہ ہاتھ میں جہاں زخم تھا وہ بالکل چکنا تقریباً پہلے کی طرح ہو گیا ہے۔ البتہ دو لال دھاریاں دائیں بائیں نظر آتی ہیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۸۲ کو صاحبزادہ حسن صاحب (مراد آباد) میرے یہاں آئے اور زخم کو دیکھنے کے بعد میری ڈائری میں حسب ذیل سطریں لکھیں:

"۲ مارچ کو میں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ کے جلے ہوئے حصہ کو دیکھا وہ ہتھیلی سے لیکر کلائی تک تقریباً دو انچ چوڑا اور تین انچ لمبا سرخ گوشت کا لوتھڑا سا تھا۔ بظاہر یہ قابل قیاس نظر نہیں آتا کہ (خواب کے مطابق) ۴۰ دن میں وہ اپنی پہلی حالت کی طرح صاف ہو جائے گا۔"

نرسنگ ہوم میں اگرچہ میری حالت بہتر نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہاں سے میں اس لئے چلا آیا کہ گھر پر رہ کر کچھ کام کر سکوں گا۔ چنانچہ اسی حال میں الرسالہ کے کام میں لگ گیا۔ کبھی قلم کو شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے درمیان پکڑ کر لکھتا۔ کبھی اپنی لڑکی فریدہ خانم سے املا کراتا۔ میری ڈائری میں ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ کی تاریخ کے ساتھ حسب ذیل سطریں درج ہیں :

آج صبح کو مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔ میں تذکیر القرآن میں سورۃ یونس (آیات ۲۵-۲۷) کی تشریح لکھ رہا تھا۔ الکٹرک برن کی وجہ سے میری کلائی زخمی ہے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں تقریباً ۷۵ فی صد سن ہیں۔ ہاتھ اتنا کمزور ہے کہ قلم پکڑنے میں نہیں آتا۔ تاہم اسی حالت میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عین اس وقت مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خدا کو اپنے فرشتوں سے یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوں کہ :

" ذرا میرے بندے کو دیکھو ..... "

بے اختیار دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں اپنے گھر پر اسی حال میں تھا اور روزانہ دو وقت باقاعدہ ڈریسنگ ہوتی تھی، تاہم سارا معاملہ بالکل غیر یقینی نظر آتا تھا۔ جب پٹی کھولی جاتی تو کافی لمبا چوڑا اور گہرا زخم میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے بھرے گا۔ زخم کی صورت اتنی بھیانک تھی کہ اس کے کھلنے کے وقت میں بیوی بچوں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ۲ اپریل ۱۹۸۲ کو میں نے اپنا ایک وصیت نامہ لکھ دیا جو میری ڈائری کے صفحہ ۵۹ - ۶۱ پر درج ہے۔

ہمدرد نرسنگ ہوم کے ڈاکٹروں نے گریفٹنگ کا مشورہ دیا تھا۔ میرے لڑکے ثانی اثنین خان نے حادثہ کے بعد اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ثانی اثنین کا کہنا بھی یہی تھا کہ گرافٹنگ ضروری ہے۔ مگر مجھے آپریشن کے تصور سے دحشت تھی۔ اس لئے میں راضی نہ ہوا۔ میں اسی خیال میں رہا کہ دوا اور ڈریسنگ سے زخم مندمل ہو جائے۔ مگر یہ امید پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ بعض ہمدرد اصرار کر کے مجھے ولنگڈن اسپتال لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر آر بکچندانی نے خصوصی طور پر دیکھا اور شدت سے یہ مشورہ دیا آپ صفدر جنگ اسپتال میں داخل ہو جائیں

اور اپنے زخم کی گرافٹنگ کرائیں۔ بصورت دیگر، یہ زخم ایسا ہی پڑا رہے گا۔ اور اگر سالوں کے بعد قدرتی طور پر ٹھیک ہوا تو آپ کا ہاتھ مستقل طور پر ٹیڑھا ہو چکا ہوگا۔ انہوں نے صفدر جنگ اسپتال میں برن اور پلاسٹک سرجری کے انچارج ڈاکٹر جے ایل گپتا کے نام ایک ذاتی خط لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ آپ فوراً ان سے ملیں۔

اگلے دن میں اس خط کو لے کر صفدر جنگ اسپتال پہنچا اور وہاں ڈاکٹر جے ایل گپتا سے ملا۔ وہ اس فن میں ہندستان کے مشہور اکسپرٹ ہیں۔ انہوں نے زخم کو کھول کر دیکھا تو فوراً پہلا جملہ یہ کہا کہ آپ نے بہت دیر کر دی :

You are too late.

انہوں نے کہا کہ آپ کو حادثہ کے بعد فوراً ہمارے یہاں آنا چاہئے تھا۔ تاہم انہوں نے پوری ہمدردی کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی پوری کوشش کریں گے۔ آپ ہمارے اسپتال میں داخلہ لے لیں۔ انہوں نے اسپتال کا ایک خصوصی کمرہ میرے لئے کھلوا دیا اور میں ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ کو یہاں آ گیا۔

صفدر جنگ اسپتال میں زخم کی گریفٹنگ سے پہلے کچھ طبی ضابطے پورے کرنے ضروری تھے۔ چنانچہ اس کے مطابق میرے پورے جسمانی نظام کا معائنہ ہوا۔ یہ کام کئی دنوں تک ہوتا رہا۔ مگر ڈاکٹر حیرت میں تھے کہ اتنے بڑے حادثہ کے باوجود میرے جسم کی ہر چیز نارمل تھی۔ خون کی کئی طریقوں سے جانچ کی گئی۔ مگر سب رپورٹیں نارمل آئیں۔ شکر اور البومن کے بارہ میں رپورٹ بالکل اطمینان بخش تھی۔ کئی ایکسرے لئے گئے مگر سب نارمل نکلے۔ مثال کے طور پر جنرل ولیس میسانک پالی کلینک کی ریڈیولاجکل رپورٹ (۳ اپریل ۱۹۸۲) میں میرے ایکسرے کے بارہ میں یہ الفاظ درج تھے :

Cardiac size is normal. Both hila are normal. No paranchymatous lesion of lungs present. Costotphrenic angles are clear.

کئی "ماہرین" نے میرے بارہ میں یہ بات بھی کہی تھی کہ بجلی کا شاک پورے جسمانی نظام کو متاثر کر دیتا ہے۔ اس لئے آپ اچھے ہونے کے بعد بھی کئی سال تک اپنا کام صحیح طور پر کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ مگر خدا کے فضل سے مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا اور خدا نے صرف "چالیس دن" میں میرا تمام معاملہ درست کر دیا۔ اسپتال میں اور اسپتال کے باہر ڈاکٹروں کی سخت ہدایت تھی کہ میں اپنا دایاں ہاتھ اتنا اٹھائے رکھوں کہ وہ سر کے برابر یا اس سے اوپر رہے۔ میں نے اس ہدایت کی تھوڑے دنوں پابندی کی۔ اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ خدا کے فضل سے پھر بھی میرے

ہاتھ میں کوئی خرابی نہیں آئی۔ صفدر جنگ اسپتال میں مجھے کافی سکون تھا۔ بس یہی ایک چیز وحشت ناک تھی کہ دائیں ہاتھ کو رات دن سر کے برابر اٹھائے رکھنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر اگر کبھی دیکھ لیتے کہ میرا ہاتھ نیچے ہے تو فوراً کہتے "اس طرح آپ کا ہاتھ ہمیشہ کے لئے خراب ہوجائے گا۔"

صفدر جنگ اسپتال میں آتے ہی یہاں کے ڈاکٹروں نے پہلا کام یہ کیا کہ اینٹی بائیوٹک دوائیں سب کی سب بند کردیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں اینٹی بائیوٹک دواؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تو صرف ڈریسنگ کرنی ہے اور اس کے بعد اسکن گریفٹنگ۔ چنانچہ چند دن تک ڈریسنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب ان کے خیال کے مطابق زخم تیار ہوگیا تو ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ کو مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنائے گئے اور آپریشن ٹیبل پر لٹا کر میرے منہ پر ایک آلہ رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے جس واقعہ کی خبر ہے وہ یہ کہ میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اپنے کمرہ میں پایا۔ "میرا آپریشن کب ہوگا"، میں نے پوچھا "وہ تو ہو بھی گیا"، جواب دینے والے نے جواب دیا۔ آپریشن تھیٹر میں میرا زخم کھرچ کر صاف کیا گیا۔ میرے دوسرے ہاتھ کے بازو سے تقریباً پانچ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا چمڑا (پتلا کاغذ جیسا) کاٹ کر نکالا گیا۔ اس کو میرے زخم پر رکھ کر سلا گیا۔ اس کے بعد دونوں جگہ پٹی کی گئی۔ مگر مجھے کسی چیز کی کچھ خبر نہیں ہوئی۔ میں نے اس پورے واقعہ کو اس وقت جانا جب کہ وہ انجام پا چکا تھا۔ یہ سب کمال تھا جدید سرجری کی اس دریافت کا جس کو عمل تخدیر (Anaesthesia) کہا جاتا ہے۔

گریفٹنگ کے بعد مجھے کچھ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲۶ اپریل کو میری پٹی کھول دی گئی اور مجھے اجازت دیدی گئی کہ میں گھر جا سکتا ہوں۔ اسی گریفٹنگ میں خدا نے میرے حادثہ کا علاج رکھا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر گپتا کا کہنا یہ تھا کہ آپ کو ٹھیک ہونے میں ابھی تین سال لگیں گے۔ نیز انہوں نے کئی ورزشیں بتائیں اور کہا کہ اگر آپ نے یہ ورزشیں نہ کیں تو پھر کبھی آپ کا ہاتھ ٹھیک نہ ہو سکے گا۔ مگر میں نے کوئی ورزش نہیں کی اور خدا کے فضل سے صرف چند مہینہ میں میرا ہاتھ ہر اعتبار سے بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ شانہ کے فریکچر کے اعتبار سے بھی اور ہاتھ کے الکٹرک برن کے لحاظ سے بھی۔ اب میں خدا کے فضل سے اپنے تمام کام معمول کے مطابق کر لیتا ہوں۔ ہاتھ پر صرف ایک انچ لمبا اور آدھا انچ چوڑا گریفٹنگ کا نشان ہے۔ اب اپنا ہاتھ مجھے تقریباً ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ میں نے ۱۰ مارچ ۱۹۸۲ کو خواب میں دیکھا تھا۔

خواب کے مطابق ابتداءً میں نے سمجھا تھا کہ "بہ دن" میں میرا ہاتھ صحیح ہو جائے گا۔ مگر بعد کو سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد آغاز صحت تھا نہ کہ تکمیل صحت۔ حادثہ کے ٹھیک چالیسویں دن میری کلائی کی اسکن گریفٹنگ ہوئی۔ اور اسکن گریفٹنگ ہی وہ عمل تھا جس کے بعد میرا بھیانک زخم بھرا اور دھیرے دھیرے ہاتھ بالکل صحیح ہو گیا۔ خواب بالکل درست تھا، البتہ جب میں نے اس کی تعبیر کی تو مدت کے تعین میں تھوڑی سی غلطی کر دی۔

بجلی کا لگنا کتنا خطرناک ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۶ جون ۱۹۸۳ کو ایک بس مظفر پور (بہار) کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ سڑک پر بجلی کا ایک تار لٹک رہا تھا جس میں بجلی کا کرنٹ موجود تھا۔ یہ تار بس سے چھو گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ فوراً پوری بس میں بجلی دوڑ گئی۔ چالیس مسافر اسی وقت بجلی لگنے سے مر گئے۔ دوسرے بارہ آدمی جزئی طور پر جل گئے اور بے ہوش حالت میں اسپتال پہنچائے گئے (ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی ۷ جون ۱۹۸۳)

مجھے بھی اسی بجلی سے سابقہ پیش آیا۔ جو مذکورہ بس کے مسافروں کو پیش آیا تھا مگر یہ خدائی معجزہ ہے کہ میں حیرت انگیز طور پر اس سے بچ گیا۔ اور میرا پورا جسم اس کے اثرات سے محفوظ رہا۔ اس پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

عجیب اتفاق کہ جس زمانہ میں یہ حادثہ پیش آیا اسی زمانہ میں میرے دو پروگرام پیشگی طور پر مقرر ہو چکے تھے ایک، اسلامی مرکز کا پہلا اجتماع، ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲ کو بھوپال میں۔ دوسرا، دورے کا پروگرام اپریل ۱۹۸۲ کے آخری ہفتہ، بمبئی میں

ان دونوں پروگراموں کا اعلان ماہنامہ الرسالہ میں دیا جا چکا تھا۔ مگر مذکورہ حادثہ نے سارے معاملہ کو درہم برہم کر دیا۔ چنانچہ بمبئی کے دورہ کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں منتظمین کو معذوری کا خط لکھ دیا گیا۔ البتہ بھوپال کا اجتماع کافی مشورہ کے بعد باقی رکھا گیا۔ مگر عین انہیں دنوں میں صفدر جنگ اسپتال میں داخل تھا۔ اس لئے پہلے دن کی کاروائی میں شریک نہ ہو سکا۔ البتہ دوسرے دن کی کاروائی میں شرکت کی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کو گرینڈ ٹرنک اکسپریس سے روانہ ہو کر ۱۸ اپریل کی صبح کو بھوپال پہنچا اور پھر اسی دن شام کو دوبارہ گرینڈ ٹرنک اکسپرس سے سوار ہو کر ۱۹ اپریل کی صبح کو دھلی آگیا۔ جاتے ہوئے میں صفدر جنگ اسپتال کے بستر سے اٹھ کر اسٹیشن گیا تھا اور دوبارہ واپسی

میں اسٹیشن سے آکر اسپتال کے بستر پر لیٹ گیا۔

بھوپال کے اجتماع میں پہلے دن میری دو تقریریں مولانا محسن عثمانی ندوی نے پڑھ کر سنائیں۔ یہ دونوں تقریریں میں نے کچھ املا کرائی تھیں اور کچھ خود اپنے زخمی ہاتھ سے لکھی تھیں۔ لکھنے کی صورت یہ تھی کہ میں قلم کو شہادت کی انگلی اور درمیان کی انگلی کے درمیان پکڑ کر لکھتا تھا۔ کیونکہ انگوٹھا اس وقت قلم پکڑنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

یہ ماجرا جو میرے ساتھ گزرا اس کا شاید سب سے زیادہ خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مجھ کو مادہ (Matter) اور ذہن (Mind) کا فرق بتایا گیا۔ میں نے اس کے دوران مادہ کی فنا پذیری کو دیکھا اور اس کے مقابلہ میں ذہن کے غیر فنا پذیر ہونے کا تجربہ کیا۔ عین اس وقت جبکہ بجلی کے طاقتور کرنٹ کی زد میں آکر میرا جسم پوری طرح مردہ ہو چکا تھا، میرا ذہن پوری طرح زندہ تھا۔ میں نے ذاتی تجربہ کے ذریعہ شعوری طور پر یہ جانا کہ فنا کے قوانین صرف انسان کے مادی جسم پر وارد ہوتے ہیں، وہ اس کے ذہن یا روح پر وارد نہیں ہوتے۔ یہ گویا فانی کے اندر باقی کو دیکھنا تھا۔ طبیعی دنیا کے ماورا ایک غیر طبیعی دنیا کا مشاہدہ کرنا تھا۔ مخلوق کی سطح کے وجود کے درمیان خدائی سطح کے وجود کا عرفان حاصل کرنا تھا۔

یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ کو میں دہلی سے حیدرآباد جا رہا تھا۔ پالم ایرپورٹ پر پہنچا تو وہاں اسکن سرجری کے مذکورہ ماہر ڈاکٹر جے ایل گپتا بھی موجود تھے۔ وہ اب صفدر جنگ اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ چنڈی گڑھ جا رہے تھے۔

ڈاکٹر گپتا مجھ کو دیکھتے ہی فوراً پہچان گئے۔ اور میرا حال پوچھنے لگے۔ میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب، آپ نے کہا تھا مجھ کو ٹھیک ہونے میں کم از کم تین سال لگیں گے۔ مگر میں تو خدا کے فضل سے تین مہینہ میں بالکل اچھا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا اچھا کسی دن اسپتال آئیے۔ پھر بات بدل کر اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہوئے اور ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

He is a member of Parliament,
very close to the Prime Minister.

(یہ ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں اور وزیر اعظم سے ان کے بہت قریبی تعلقات ہیں)

ڈاکٹر گپتا کا مذکورہ بیان خلط مبحث کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ میں نہ پارلیمنٹ کا ممبر ہوں اور نہ وزیر اعظم ہند سے میرا قریبی تعلق ہے۔ قصہ صرف یہ ہے کہ نائب صدر جمہوریہ ہند

جناب محمد ھدایت اللہ صاحب ماہنامہ الرسالہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میں صفدر جنگ اسپتال میں ہوں تو انہوں نے ڈاکٹر گپتا کے نام ایک خط بھجوایا اور پھر سکرٹری سے ٹیلی فون کرایا جس میں میری خیریت پوچھی گئی تھی اور ڈاکٹر گپتا سے کہا گیا تھا کہ نائب صدر جمہوریہ ہند مجھ کو دیکھنے کے لئے اسپتال آنا چاہتے ہیں۔ یہ اصل واقعہ تھا جو گڈمڈ ہو کر ان کے ذہن میں یوں بن گیا کہ میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں اور وزیر اعظم ہند کا بہت قریبی آدمی ہوں ـــــ معلوم دنیا کے بارہ میں انسان کے اندازے اتنے غلط ہوتے ہیں۔ پھر غیر معلوم دنیا کے بارہ میں اس کے اندازے اگر غلط ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

صفدر جنگ اسپتال کے اندر میں تین ہفتہ رہا۔ یہاں میں نے اپنے ساتھ اپنے لڑکے ثانی ثنین خان کو رکھا تھا وہ ڈاکٹری کی کئی کتابیں لائے تاکہ فارغ اوقات میں اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں۔

انہیں میں سے ایک کتاب پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) کی تھی جس کا نام پیتھالوجی (A Textbook of Pathology) ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میری چمڑے کی قلم بندی (Skin Grafting) ہونے والی ہے تو میں نے اس موضوع پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہا۔ اس سلسلہ میں مذکورہ کتاب کا متعلقہ باب اسپتال ہی میں پڑھ ڈالا۔

مصنف نے بتایا تھا کہ انسانی جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے اپنے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصۂ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے۔ اس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے۔ اس کو آٹو گریفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا کھال کا مذکورہ ٹکڑا کالا ہو جائے گا اور بالآخر الگ ہو کر گر جائے گا۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے مصنف نے ایک عجیب جملہ لکھا تھا۔ اس نے لکھا کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

یہ جملہ پڑھ کر معاً مجھے خیال آیا کہ جب چھوٹے سلف کا یہ حال ہے کہ وہ غیر سلف کو قبول نہیں کرتا تو

بڑا سلف کیوں کر غیر سلف کو قبول کرے گا۔ مخلوق کی نفاست اپنے غیر ہم جنس کو قبول نہیں کرتی پھر پاک اور برتر خالق کس طرح اپنے غیر ہم جنس کو قبول کرنے پر راضی ہو جائے گا۔

ایک واقعہ اس معاملہ کی بہت اچھی وضاحت کرتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۲ میں ایک شخص رات کے وقت لندن کے بکنگھم پیلس میں گھسا اور ملکہ الزبتھ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا۔ ملکہ الزبتھ اس وقت اپنے سونے کے کمرہ میں اکیلی تھیں۔ انہیں خطرہ لاحق ہوا۔ کیونکہ نو وارد کے ہاتھ میں لوہے کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ ملکہ نے گھنٹی بجا کر حفاظتی دستہ کو بلانا چاہا مگر کسی وجہ سے گھنٹی نہیں بجی۔ اب ملکہ نے حاضر دماغی سے کام لیا اور نو وارد سے سخت کلامی کرنے کے بجائے اس کو سگرٹ پیش کیا اور اس کو تفریحی باتوں میں مشغول رکھا۔ یہاں تک کہ حفاظتی عملہ کے لوگ آ گئے اور آدمی گرفتار کر لیا گیا۔

یہ خبر جب لندن کے اخباروں میں چھپی تو عوام نے سوال کرنا شروع کیا کہ ملکہ الزبتھ اپنی خواب گاہ میں تنہا کیوں تھیں۔ ملکہ کے شوہر جناب فلپ اس وقت کہاں تھے :

Where was Philip

بالآخر انکشاف ہوا کہ جناب فلپ نیند میں خراٹے لیتے ہیں۔ چونکہ ملکہ کو خراٹے کی آواز پسند نہیں، اس لئے ان کے شوہر فلپ رات کے وقت علیحدہ کمرہ میں سلائے جاتے ہیں۔ ان کو ملکہ کی خواب گاہ میں سونے کی اجازت نہیں۔ گرافٹنگ کا معاملہ اگر یہ بتا رہا تھا کہ نیچر کس طرح غیر سلف کو قبول نہیں کرتی تو یہ دوسرا واقعہ بتاتا ہے کہ شعور کے نزدیک کس طرح غیر سلف ناقابل قبول رہتا ہے۔

کتاب پیتھالوجی کا مذکورہ جملہ (سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرتا) میرے لئے زمانۂ علالت کی ایک دلچسپ دریافت تھی۔ جب میں اس کو مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہوں جو اس کو پانے کا سبب بنا تو اس دنیوی واقعہ میں مجھے ایک اخروی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ لمحات کے لئے خدا کے یہاں چلا گیا تھا اور وہاں سے اس کے بندوں کے لئے اس کا یہ پیغام لے کر لوٹا کہ ـــــ سلف غیر سلف کو قبول نہیں کرے گا۔ جس کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی تمنا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدائی اخلاقیات کو اختیار کرے، وہ اپنے آپ کو خدائی مزاج کے مطابق بنائے۔ ورنہ آخرت میں اس کو خدا کی دوری ملے گی نہ کہ خدا کا پڑوس۔

معرفت

ہندستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں نے جو چیزیں دریافت کی ہیں ان میں ان کا اپنا کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ یہ دریافتیں زیادہ تر اتفاقات کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا: ہاں ، مگر ایسا اتفاق صرف سائنس داں کو پیش آتا ہے۔

دریافت دراصل ذہنی ترکیز (Concentration of Mind) کی قیمت ہے۔ جب آدمی کسی خاص موضوع پر اپنے ذہن کو پوری طرح لگا دیتا ہے تو اس موضوع کے بارہ میں اس کو خاص بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس کا ذہن اسی کے اندر مشغول رہتا ہے۔ اس موضوع کی دنیا سے اس کا بے حد قریب فکری رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

سائنسی دریافتیں اکثر اسی قسم کے ترکیز فکر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب ایک آدمی کسی چیز سے اتنا زیادہ اپنے کو متعلق کر لیتا ہے تو اس چیز کے بارہ میں اس کو خاص پہچان حاصل ہو جاتی ہے۔ ذرا سا اشارہ دیکھتے ہی وہ اس کی پوری بات کو پکڑ لیتا ہے۔ دریافت اکثر حالات میں جزء سے کل تک پہنچنے کا دوسرا نام ہوتی ہے، اور اس قسم کا پہنچنا ہمیشہ اسی کے لئے ممکن ہوتا ہے جو پہلے سے اس موضوع میں لگا ہوا ہو اور اس کی بابت پوری آگہی رکھتا ہو۔

یہ بات جو سائنسی معرفت کے لئے صحیح ہے یہی دینی معرفت کے لئے بھی درست ہے۔ خدا بھی آدمی کے لئے ایک دریافت ہے۔ مگر یہ دریافت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو خدا میں شامل کر رکھا ہو۔

جب آدمی اپنا ذہن خدا میں لگائے ہوئے ہو۔ وہ خدا کی نظر سے دیکھتا ہو اور خدا کے کان سے سنتا ہو۔ وہ دوسری تمام باتوں سے اپنی توجہ ہٹا کر خدا کی طرف مائل ہو گیا ہو، جب کوئی شخص اس قسم کی زندگی گزارے تو اس کو بار بار وہ اتفاقات پیش آتے ہیں جن کو معرفت کہا جاتا ہے۔ دنیا کی چیزوں کا مشاہدہ، انسانی تاریخ کا مطالعہ، اپنے حالات پر غور و فکر ہر چیز میں اس کا ذہن، بار بار حقیقت اعلیٰ کی طرف منتقل ہوتا ہے، وہ بار بار ربانی تجلیات کو پاتا رہتا ہے۔ خدا کی معرفت خدا میں جینے کی نقد قیمت ہے۔ یہ قیمت اسی کو ملے گی جو خدا میں جی رہا ہو۔ جو کسی اور چیز میں جیے وہ خدائی معرفت کا رزق کبھی نہیں پا سکتا۔

جنت بھی اور جہنم بھی

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان العبد لیتکلم بالکلمۃ من رضوان اللہ لا یلقی لھا بالا یرفع اللہ بھا درجات وان العبد لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللہ لا یلقی لھا بالا یھوی بھا فی النار ابعد ما بین المشرق والمغرب۔

(متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ اللہ کی رضا میں ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اللہ اس کی وجہ سے اس کے درجے بہت بڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ ایسی آگ میں ڈال دیا جاتا ہے جس کا فاصلہ مشرق و مغرب سے زیادہ ہو۔

وہ کون سی بات ہے جو کہنے میں تو بظاہر صرف ایک معمولی بات ہوتی ہے مگر اخروی نتیجہ کے اعتبار سے وہ اتنی سنگین ہوتی ہے کہ آدمی کو یا تو جنت میں پہنچا دیتی ہے یا جہنم میں۔ یہ بات وہ ہے جب کہ آدمی صرف اللہ کی خاطر ایک شخص کے بارہ میں حق کا کلمہ کہے۔ یا اللہ سے بے خوف ہونے کی وجہ سے کسی کے بارہ میں ناحق بات بولے۔

زندگی میں بار بار ایسے نازک مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کی زبان سے نکلا ہوا جملہ دوسرے شخص کے لئے نہایت اہم بن جاتا ہے۔ کبھی ایک جملہ کسی کی واقعی حیثیت کا اعتراف کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کی حیثیت پر پردہ ڈالنے والا۔ کبھی ایک جملہ دوسرے کی عزت کو بچانے والا ہوتا ہے اور دوسرا جملہ اس کو بے عزت کر دینے والا۔ کبھی ایک جملہ حسد میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور کبھی ایک جملہ خیر خواہی میں نہایا ہوا۔

ایسے مواقع پر خدا سے ڈرنے والا آدمی اپنے منھ سے وہ ذمہ دارانہ لفظ نکالے گا جو خدا کو خوش کرنے والا ہو اور اس بنا پر وہ خدا کی جنت کا مستحق بن جائے گا۔ اور جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ ایسے غیر ذمہ دارانہ الفاظ بولے گا جس میں اس کا اپنا نفس لذت پا رہا ہو اور اس کی وجہ سے وہ جہنم کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

تاریخ کا نوشتہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷ کو تہران کے قصر گلستاں میں ایک بے حد شاندار جشن منایا گیا۔ یہ سابق شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی تھی۔ اس موقع پر جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا اس کے اخراجات کی مقدار اربوں روپے تک پہنچتی ہے۔ اس زمانے میں راقم الحروف نے "شاہ ایران کی تاج پوشی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں جشن کی مسرفانہ تفصیلات دیتے ہوئے آخر میں لکھا تھا۔

"یہ شاہ قسم کے لوگ بھی حالات سے کتنا بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ عوامی انقلاب کے آتش فشاں پہاڑ کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے اس آتش فشاں کو کچھ اور چنگاریاں حاصل ہو جائیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو ان جھوٹے مظاہروں میں سرمایہ خرچ کرنے کے بجائے وہ عوام کو مطمئن کرنے کے لئے خرچ کرتے۔ اس طرح اگرچہ ان کے اصلی عیش اور اقتدار میں کمی نہ ہوتی مگر عوام کو خوش کر کے وہ اپنی شہنشاہیت کی عمر کو ضرور طویل کر سکتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ اس دنیا میں حقیقی فکرِ آخرت تو نایاب ہے ہی، دانش مندانہ قسم کی دنیا پرستی بھی نایاب ہے۔ زیادہ تر لوگ بے سوچے سمجھے زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بے شعوری کے انجام سے دو چار ہوتے ہیں اس وقت انھیں ہوش آتا ہے۔ مگر اس وقت کا ہوش آنا کچھ کام نہیں دیتا" (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی ۳ نومبر ۱۹۶۷)

مذکورہ تحریر کے تقریباً ساڑھے گیارہ سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں یہ واقعہ ہوا کہ رضا شاہ پہلوی کو اپنا اقتدار اور اپنا تمام جاہ و حشمت چھوڑ کر ایران سے جانا پڑا۔ وہ نہایت مایوسی اور ناکامی کی حالت میں ایک مغربی اسپتال میں مر گئے۔

اس کے بعد ایران میں آیت اللہ خمینی کا دور شروع ہوا۔ فروری ۱۹۷۹ میں جب آیت اللہ خمینی چارٹرڈ ہوائی جہاز کے ذریعہ پیرس سے تہران پہنچے اور سارا ایران خمینی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خمینی اسلام کے نام پر ایران میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ ساری دنیائے اسلام میں اس بات پر خوشی منائی گئی کہ آیت اللہ خمینی نے ایران میں اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔

تاہم اس معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے عام لوگوں سے بالکل مختلف رہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جدید حکمراں بھی بالآخر وہی ثابت ہوں گے جو ان سے پہلے کے حکمراں۔

ذمہ دار کون

انیسویں صدی کے وسط کا واقعہ ہے۔ فرانس کے ایک مسیحی مسٹر لیون روش نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ امیر عبدالقادر الجزائری کے یہاں آیا اور امیر کے ہاتھ پر اسلام لایا۔ اس کے بعد امیر عبدالقادر الجزائری نے اس کو قربت دی۔ اس کو اپنا مشیر خاص بنالیا۔ کئی مہمات میں اس کو بھیجا۔ اسی طرح اس کو جزیرہ عرب بھیجا جہاں اس نے حج ادا کیا۔

لیون روش کی شادی الجزائر کی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی۔ دونوں تقریباً ۱۰ سال تک ایک ساتھ رہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ فرانس کی فوجیں الجزائر میں داخل ہوگئیں۔ جنگ کے بعد بالآخر فرانس کو امیر عبدالقادر الجزائری پر فتح حاصل ہوئی۔ اس فتح کے بعد لیون روش فرانسیسی جنرل الدوک دومال سے مل گیا اور کھلم کھلا اعلان کردیا کہ میں نے اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ مسیحیت اختیار کرلی ہے۔

یہ واقعہ لیون روش کی مسلمان بیوی کے لئے بہت اندوہناک تھا۔ اس نے کہا کہ اسلام نے اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی کردی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تیرے جیسا سانپ زندہ رہے اور لوگ مجھ کو تیری وجہ سے غیرت دلائیں۔ چنانچہ اس نے خنجر لے کر لیون کو قتل کر ڈالا (الثقافۃ العربیۃ، طرابلس دسمبر ۱۹۸۲)

اس طرح کے ارتداد کے واقعات کو عام طور پر اس معنی میں لیا جاتا ہے کہ متعلقہ شخص محض منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اور اپنا کام پورا کرکے اسلام سے نکل گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی ہوں۔ مگر اس نظریہ کو ارتداد کے تمام واقعات پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر وہ ہیں جو کسی تبلیغی جدوجہد کے نتیجہ میں مسلمان نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ اسلام قبول کرلیتے ہیں۔ میں نے بہت سے نومسلموں سے بات کرکے یہ اندازہ کیا ہے کہ ان کے اسلام کا سبب کوئی گہرا فکری انقلاب نہیں ہوتا۔ یہ اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے مذہب کے معاملہ میں متشدد اور متحمس نہیں ہوتے۔ وہ کسی وقتی اور معمولی پسندیدگی کی بنا پر اسلام قبول کرلیتے ہیں۔ اب اگر ان کو خوش قسمتی سے موافق حالات مل گئے تو وہ دھیرے دھیرے اسلام میں پختہ ہوجاتے ہیں۔ ان کا ابتدائی معمولی

تاثر بالآخر گہرے اسلامی تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر جن کو اسلام کے بعد اچھے حالات نہ ملیں ان کا اسلام کمزور ہوتا رہتا ہے۔ وہ ان کے شعور کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے کمزور اسلام کے ساتھ زندگی گزارتے رہے ہیں اور کچھ لوگ دوبارہ اپنے سابق معاشرہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ وہ جس طرح ایک معمولی سبب کے پیش آنے سے اسلام میں داخل ہوئے تھے اسی طرح دوسرا معمولی سبب پیش آنے سے اسلام کے باہر چلے جاتے ہیں۔

ایک نومسلم کا مسلم معاشرہ میں جذب ہونا مسلم معاشرہ کی ذمہ داری ہے، مگر مسلم معاشرہ یہاں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نومسلم اپنے نئے ہم مذہبوں کے درمیان ایک قسم کا اجنبی بن جاتا ہے۔ یہ اجنبیت کبھی کبھی اپنی انتہا پر پہنچ کر وہ صورت اختیار کر لیتی ہے جس کو ہم "ارتداد" کہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ارتداد کے اکثر واقعات دشمنان اسلام کی "سازش" سے زیادہ مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہیں۔ یہ غفلت خاص طور پر تین قسم کی ہے۔

۱۔ دعوت و تبلیغ کا کام ہمارے یہاں اس نہج پر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر گہرا فکری انقلاب پیدا کرے۔ آدمی شعوری تبدیلی کے بغیر کسی سطحی یا عارضی سبب سے اسلام قبول کر لیتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا اسلام بہت زیادہ دیر پا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ایک نومسلم جب اسلام قبول کرتا ہے تو وہ ایک بالکل مختلف معاشرہ سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اسلام میں پختہ کرنے کے لئے اس کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ مگر مسلمانوں کے یہاں ایسے لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا کوئی سامان موجود نہیں۔ یہ تربیت تمام تر مسلمانوں کی ذمہ داری ہے مگر اس کے لئے انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا مسئلہ معاشرہ کا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد نومسلم ایک طرف اپنے معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف مسلم معاشرہ بھی اس کو بھرپور طور پر قبول نہیں کرتا۔ یہ دوطرفہ اجنبیت اس مخلوق کے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہے جس کی تعریف سماجی حیوان Social Animal سے کی گئی ہے۔

اس طرح کے مختلف اسباب اکثر نومسلموں کے اندر چھپی ہوئی بے چینی بن کر موجود رہتے ہیں، وہ مسلسل عدم اطمینان کا شکار رہتے ہیں اور کوئی بڑا واقعہ پیش آنے کی صورت میں اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ اپنے ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

معیاری خاتون

روی البخاری ومسلم ان علیا سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: خیر نسائھا مریم بنت عمران وخیر نسائھا خدیجۃ بنت خویلد

بخاری ومسلم نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ان کی سب سے بہتر خاتون مریم بنت عمران تھیں۔ اور ان کی سب سے بہتر خاتون خدیجہ بنت خویلد ہیں۔

فتح الباری میں طیبی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الضمیر الاول راجع الی الامۃ التی کانت فیہا مریم والثانی الی ہذہ الامۃ۔ یعنی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریم امت یہود کی سب سے بہتر خاتون تھیں اور حضرت خدیجہ امت مسلمہ کی سب سے بہتر خاتون ہیں۔

یہ افضلیت کیوں تھی، اس پر مندرجہ ذیل دو احادیث سے روشنی پڑتی ہے:

روی البخاری ومسلم عن عائشۃ انہا قالت: ماغرت علی نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا علی خدیجۃ، وانی لم ادرکہا، قالت: وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا ذبح الشاۃ فیقول ارسلوا بہا الی اصدقاء خدیجۃ، قالت فاغضبتہ یوما فقلت: خدیجۃ! فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی قد رزقت حبہا

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں مجھے خدیجہ کے سوا کسی کے اوپر غیرت نہیں آئی۔ حالانکہ میں نے ان کا زمانہ نہیں پایا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بکری ذبح کرتے تو فرماتے کہ اس میں سے خدیجہ کی دوستوں کو بھیج دو۔ وہ کہتی ہیں کہ ایک روز مجھے اس پر غصہ آگیا اور میں نے کہا خدیجہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدیجہ کی محبت مجھے پلا دی گئی ہے۔

روی احمد والطبرانی من طریق مسروق عن عائشۃ قالت، کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یکاد یخرج من البیت حتی یذکر خدیجۃ فیحسن الثناء علیہا فذکرہا یوما من الایام فاخذتنی الغیرۃ فقلت ھل کانت الا عجوزا قد ابدلک اللہ خیرا منہا۔ فغضب ثم قال لا واللہ ما ابدلنی اللہ خیرا منہا۔ آمنت اذ کفر الناس وصدقتنی

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ کی تعریف کئے بغیر گھر سے نہ نکلتے تھے۔ ایک روز آپ نے خدیجہ کا ذکر فرمایا تو مجھے غیرت آگئی۔ میں نے کہا وہ ایک بڑھیا ہی تو تھیں اور اللہ نے اس کے بدلے آپ کو زیادہ بہتر دیدیا ہے۔ آپ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا۔ خدا کی قسم نہیں، خدا نے مجھے خدیجہ سے بہتر نہیں دیا۔ وہ

اذکذبنی الناس و واستنی بمالہا اذحرمنی الناس	ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے انکار کیا۔ انہوں نے میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھے جھٹلا دیا۔
ورزقنی اللہ منہا الولد دون غیرہا من النساء	انہوں نے اپنے مال سے میری مدد کی جب کہ لوگوں نے مجھے محروم کیا۔ اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد دی جو دوسری بیویوں سے نہ دی۔

حضرت مریم اور حضرت خدیجہ کو تاریخ کی معیاری خواتین کی حیثیت کیوں حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں ملا دیا۔

یہود کے آخری زمانہ میں ایک ایسی خاتون درکار تھیں جو حضرت مسیح جیسے معجزاتی پیغمبر کی ماں بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ قوم یہود کے آخری پیغمبر کو باپ کے بغیر پیدا کرے۔ اس مقصد کے لئے ایسی خاتون درکار تھیں جن کی عصمت اور پاکبازی اتنی مسلّم ہو کہ کسی کو ان کے بارہ میں ادنیٰ شبہہ کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت مریم نے اپنی غیر معمولی زندگی سے اس کا ثبوت دیا۔ اس لئے وہ حضرت مسیح کی ماں بنائے جانے کے لئے چن لی گئیں۔

اسی طرح آخری رسول کے حالات کے اعتبار سے ان کو ایسی خاتون کی ضرورت تھی جو اپنی زندگی اور اپنا اثاثہ پوری طرح پیغمبر کے حوالے کر دیں اور کبھی کسی بات پر شکایت نہ کریں۔ حضرت خدیجہ کے امتیازی اوصاف کی بنا پر خدا نے ان کو اس خدمت خاص کے لئے چن لیا۔ انہوں نے اپنی زندگی، اپنا اثاثہ، اپنا آرام و راحت، سب کچھ پیغمبر خدا کے لئے وقف کر دیا۔ سخت ترین مصائب کے باوجود کبھی اف نہ کیا۔ ان کی انہیں خصوصیات نے انہیں خدا کی نظر میں اس قابل بنایا کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کی رفیقۂ حیات بنیں۔

اسلام کے مشن کے لئے ہر دور میں ایسی عورتوں اور ایسے مردوں کی ضرورت ہوتی ہے جو موجودہ امتحانی دنیا میں زیر عمل لائے جانے والے خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کریں۔ جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد صبر آزما عمل ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں خدا کی مدد کرنا کہا گیا ہے۔ پھر جس کو خدا اپنا مددگار ہونے کا اعزاز بخشے اس کے فضل و کمال کا کیا ٹھکانا۔

کمپوٹر کا لطیفہ

اقوام متحدہ کی کارروائی پر ایک کتاب چھپی ہے جس میں ایک دل چسپ واقعہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ میں نہایت اعلیٰ قسم کے کمپوٹر لگائے گئے ہیں جو خود کار ترجمان کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور کسی مقرر کی تقریر کا فوراً ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ سامعین میں سے جو شخص مقرر کی زبان نہ جانتا ہو وہ کمپوٹر سے جڑے ہوئے آلہ کو اپنے کان سے لگا کر غیر زبان کی تقریر کو اپنی زبان میں سننے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں بائبل کا ایک اقتباس پڑھا۔ یہ اقتباس انگریزی اڈیشن کے مطابق یہ تھا:

The spirit is willing but the flesh is weak.

اس جملہ کا مفہوم ہے: روح مستعد ہے پر جسم کمزور ہے۔ مگر کمپوٹر نے اس کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا تو اس کو یوں کر دیا: شراب اچھی ہے مگر گوشت خراب ہے۔ انگریزی میں کمپوٹر کے ترجمہ کو ان لفظوں میں بتایا گیا ہے۔

The wine is good but the meat is bad.

یہ غلطی کیوں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمپوٹر کی نام نہاد ذہانت محض مشینی ذہانت ہوتی ہے۔ وہ صرف ایک بتائی ہوئی بات کا اعادہ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاضیاتی نوعیت کی باتوں کی ترجمانی میں کمپوٹر کامیاب رہتا ہے۔ مگر جہاں شعور کے استعمال کی ضرورت ہو اور ایک سے زیادہ امکانی چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے وہاں وہ صحیح جواب پیش کرنے میں اکثر ناکام ہو جاتا ہے۔ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے کئی معنیٰ آتے ہیں اور استعمال سے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ آدمی کے سامنے جب ایسا مضمون آتا ہے تو وہ اپنی ذہانت سے جان لیتا ہے کہ کسی خاص موقع پر کس لفظ کے کیا معنیٰ ہیں۔ مگر کمپوٹر چونکہ اس قسم کی انسانی ذہانت سے خالی ہوتا ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پاتا اور کچھ کا کچھ ترجمہ کر دیتا ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا فقرہ میں کمپوٹر نے اسپرٹ کو شراب کے معنی میں لے لیا اور ولنگ کو خوش گوار کے معنی میں۔ اسی طرح اس نے فلش کو گوشت کے معنی میں لیا اور ویک کو ناقص کے معنی میں۔ ان الفاظ کے یہ معانی بھی آتے ہیں۔ مگر مذکورہ فقرہ میں یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں ہیں۔

اس قسم کی غلطی صرف کمپوٹر ہی کی خصوصیت نہیں۔ انسان بھی اس قسم کی بھیانک غلطیاں کرتا ہے۔ مزید یہ کہ کمپوٹر اپنی غلطی کی بنیاد پر کوئی "تحریک" نہیں چلا سکتا۔ جب کہ انسان اس خوش قسمتی کا مالک ہے کہ اپنی غلطی کو ایک عظیم انقلابی تحریک کی حیثیت دے سکے۔

جنت میں مکان

انا زعیم ببیت فی ربض الجنة لمن ترك المراء وان کان محقا وببیت فی وسط الجنة لمن ترك الکذب وان کان مازحا وببیت فی اعلی الجنة لمن حسن خلقه (الحدیث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت کے کنارے ایک گھر کی ذمہ داری لیتا ہوں اس شخص کے لئے جو جھگڑے کو چھوڑ دے خواہ وہ حق پر ہو۔ اور جنت کے بیچ میں ایک گھر کی اس شخص کے لئے جو جھوٹ کو ترک کر دے خواہ وہ مذاق کر رہا ہو۔ اور جنت کے اعلیٰ درجہ میں ایک گھر اس شخص کے لئے جس کا اخلاق اچھا ہو۔

دو آدمی میں جھگڑا ہو تو دیکھنے کا ایک پہلو یہ ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر دونوں اپنے موقف پر اڑے رہیں تو جھگڑا بڑھتا ہے۔ جان و مال کی تباہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ سے ڈرنے والے کو یک طرفہ طور پر جھگڑے سے الگ ہو جانا چاہئے۔ ایسا کرنے کے لئے اپنے نفس کو کچلنا ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔

ہنسی مذاق کے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سنجیدگی کو بھول جاتا ہے اور جھوٹ بولنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ مگر جنتی انسان وہ ہے جو سچ اور جھوٹ کے معاملہ میں اتنا حساس ہو کہ غفلت کے اوقات میں بھی اس کی زبان جھوٹ بولنے سے بچی رہے۔

حسن اخلاق دراصل حسن ایمان کا نتیجہ ہے۔ جس شخص کا ایمان اس کو خدا سے ڈرنے والا بنا دے وہ بندوں کے معاملہ میں اس کو بے حد محتاط بنا دیتا ہے۔ اس کی زبان کسی کی بے آبروئی کے لئے نہیں کھلتی۔ اس کا ہاتھ کسی کو تکلیف دینے کے لئے نہیں اٹھتا۔ اس کے پاؤں کسی کی بدخواہی کے لئے نہیں چلتے۔ یہی حسن اخلاق ہے اور یہ حسن اخلاق جس کے اندر پیدا ہو جائے وہ یقیناً جنت میں اعلیٰ مقام پاتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے آدمی کو اعلیٰ جنت اسی طرح ملتی ہے جس طرح اعلیٰ بیج سے اعلیٰ پھل والا درخت۔

حیدرآباد کا سفر

حیدرآباد کا پہلا سفر میں نے ۱۹۴۸ کے شروع میں کیا تھا۔ یہ سفر میرے بڑے بھائی کے کاروبار کے تحت تھا۔ اس وقت ہندستان آزاد ہو چکا تھا۔ مگر ابھی پولس ایکشن (ستمبر ۱۹۴۸) کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور "حضور نظام" کی کم از کم ظاہری شان و شوکت بدستور باقی تھی۔

اس چند روزہ قیام میں ایک روز کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ میں شہر کی کسی شاہراہ پر چل رہا تھا۔ اچانک پولس کی وردی میں بہت سے لوگ ظاہر ہوئے اور سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہو کر سیٹیاں بجانے لگے۔ وہ شاہراہ پر چلتے ہوئے آدمیوں اور سواریوں کو کنارے کی سڑکوں اور گلیوں میں دھکیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پوری شاہراہ خالی ہو گئی۔ اس کے بعد ہمارے سامنے سے تین موٹر کاریں گزریں۔ درمیان کی کار میں "حضور نظام" بیٹھے ہوئے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہاں کا شاہی معمول ہے۔ نواب حیدرآباد جب اپنے محل سے کسی دوسرے مقام پر جاتے ہیں تو اس وقت پوری سڑک ان کے لئے خالی کر دی جاتی ہے۔ نواب حیدرآباد اگر اپنے اس انجام کو جانتے جو ان کے اور ان کے وارثوں کے ساتھ چند سال بعد پیش آنے والا تھا۔ تو اس قسم کی چیزیں ان کو فرضی تماشا معلوم ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آج کو جانتا ہے، اسے اپنے کل کی خبر نہیں۔ یہ سب سے بڑا فریب ہے جس میں ہر آدمی مبتلا ہے، خواہ وہ کوئی چھوٹا آدمی ہو یا کوئی بڑا آدمی۔

میرا دوسرا سفر نومبر ۱۹۶۷ میں ہوا۔ یہ سفر حیدرآباد میں جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع میں شرکت کے لئے تھا۔ اس سفر کی مفصل روداد اسی زمانہ میں میں نے لکھی تھی اور وہ الجمعیۃ ویکلی (یکم دسمبر ۱۹۶۷) کے صفحات میں شائع ہوئی تھی۔

حیدرآباد کے لئے میرا تیسرا سفر فروری ۱۹۸۱ میں دینی تعلیمی کانفرنس کی دعوت پر ہوا۔ دینی تعلیمی کانفرنس کی کاروائی میں شرکت کے علاوہ میں نے جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع میں بھی شرکت کی جو انہیں دنوں شہر کے باہر وادیٔ ھدیٰ میں ہو رہا تھا۔ آخر میں شہر کے تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ کے چند اجتماعات ہوئے جن میں مجھ کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ تاہم اس سفر کی کوئی تفصیلی روداد بروقت مرتب نہ کی جا سکی۔

حیدر آباد کا چوتھا سفر (۱۲ - ۱۵ نومبر ۱۹۸۲) تھا جو حلقہ الرسالہ (اسلامی مرکز حیدر آباد) کی دعوت پر ہوا۔ اس سفر کی روداد اگلے صفحات میں دی جارہی ہے۔

حیدر آباد کے لئے میرا پانچواں سفر مدرسہ سراج العلوم، محبوب نگر، حیدر آباد کی دعوت پر ہوا۔ اور چھٹا سفر مئی ۱۹۸۳ میں ہوا۔ یہ مقامی اسلامی مرکز کے بعض انتظامی امور کے تحت تھا

۱۲ نومبر ۱۹۸۲ کو حیدر آباد جانے کے لئے میں پالم ایرپورٹ پہنچا تو وہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اندر سیکوریٹی چیک میں داخل ہوا تو میرے پاس صرف ایک مختصر سا بیگ تھا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ میرے پاس کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ میں نے اپنا بیگ میز پر رکھتے ہوئے انسپکٹر سے کہا، "کیا اس کو کھولنا ہوگا" میز کے دوسرے طرف ایک سردار جی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرا جملہ سن کر بڑے تیکھے انداز میں کہا :

Why not

(کیوں نہیں) چنانچہ میں نے فوراً اپنا بیگ کھول دیا۔

سردار جی نے میرا بیگ الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں صرف ایک جوڑا کپڑا تھا اور تذکیر القرآن کی چار جلدیں۔ انہوں نے ایک جلد اٹھائی اور اس کو کھول کر کہا "یہ قرآن ہے" میں نے کہا ہاں۔ وہ اردو جانتے تھے۔ چنانچہ وہ اس کا ترجمہ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ میں قرآن کا ترجمہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کا ترجمہ میرے پاس موجود نہیں۔ میں نے کہا کہ اب تو میں حیدر آباد جارہا ہوں۔ انشاء اللہ واپسی کے بعد میں آپ کو قرآن کا ترجمہ فراہم کردوں گا۔ میں نے ان کو "حیات طیبہ" کا ایک نسخہ دیا۔ جس میں قرآن کی منتخب آیتوں کے ترجمے مختلف عنوانات کے تحت جمع کئے گئے ہیں۔

ان کا پتہ لے کر میں آگے بڑھا تو میرے ذہن میں یہ سوال تھا کہ کیا وجہ تھی کہ وہی شخص جو چند لمحہ پہلے مجھ سے خشک اور بیزار لہجہ میں بول رہا تھا، وہی چند لمحہ بعد شوق اور دلچسپی کے انداز میں بات کرنے لگا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ پہلے میں اس کے لئے "حامل بیگ" تھا، بعد کو میں اس کے لئے "حامل قرآن" بن گیا۔ "بیگ" لے کر جو لوگ ہوائی اڈہ میں داخل ہوتے ہیں ان میں ہائی جیکر ہوتے ہیں جو بم لیکر چلتے ہیں۔ ان میں اسمگلر ہوتے ہیں جو خلاف قانون چیزیں لئے ہوتے ہیں۔ ان میں حکومتوں کے باغی ہوتے ہیں جو حکومتوں کا تختہ الٹنے کا

منصوبہ لے کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاتے ہیں۔ جب میں چک کرنے والے آدمی کے سامنے حامل بیگ کے روپ میں تھا تو گویا میں ہائی جیکر، اسمگلر اور قانون کے باغی کے روپ میں تھا۔ جب میں حامل قرآن کے روپ میں اس کے سامنے آیا تو میں اس کی نظر میں مذکورہ گروہ سے الگ ہو گیا۔ اب میں ایک ایسا انسان تھا جو خدا کی سچی کتاب اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔

یہ واقعہ علامتی طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صورت حال کو بتا رہا ہے۔ ابھی تک وہ دنیا کے سامنے "حامل بیگ" بنے ہوئے ہیں اس لئے دنیا ان سے بیزار ہے۔ اگر وہ حامل قرآن کے روپ میں لوگوں کے سامنے آجائیں تو وہ دنیا والوں کے لئے دلچسپی اور محبت کا موضوع بن جائیں گے، بشرطیکہ قرآن کی خود ساختہ تشریحات سے انہوں نے قرآن کی تصویر لوگوں کی نظر میں بگاڑ نہ دی ہو۔

حیدرآباد کی آبادی لگ بھگ ۳۰ لاکھ ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً چالیس فیصد ہے۔ اکثر شہروں کی طرح حیدرآباد بھی دو حیدرآباد کا نام ہے۔ ایک پرانا حیدرآباد اور دوسرا نیا حیدرآباد ــــ پرانے حیدرآباد میں گھنی آبادی ہے۔ غریب اور جاہل طبقہ بھی اسی علاقہ میں بستا ہے۔ اس کے برعکس نئے حیدرآباد میں کھلے مکانات ہیں۔ یہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقہ رہتا ہے۔

حیدرآباد میں اکثر فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، مگر یہ تمام جھگڑے پرانے حیدرآباد میں ہوتے ہیں۔ نئے حیدرآباد میں آج تک کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا نہیں ہوا۔ اسی طرح کی تقسیم دوسرے شہروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں میں سب سے زیادہ دخل سماجی حالات کا ہے۔ جو لوگ فسادات کے نام پر "مظلوم مسلمانوں" کے لفظی حامی بنے ہوئے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے محنت کرنا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو درست کر کے زیادہ بہتر طور پر فسادات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کی کچھ انفرادی خصوصیات ہیں جو ہندستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حیدرآباد میں کم از کم علاقائی سطح پر مسلمانوں کی ایک صحافت ہے۔ یہاں اردو کے کئی اخبارات نکلتے ہیں جو یہاں کے مسلمانوں میں عام طور پر پڑھے

جاتے ہیں۔آپ شام کی ایک خبر کو اگلی صبح تک یہاں کے مسلمانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جب کہ ہندستان کے دوسرے شہروں میں یہ چیز مقابلۃً بہت کم پائی جاتی ہے۔جدید صحافتی معیار کے اعتبار سے تو مسلمان ساری دنیا میں بے حد پیچھے ہیں۔ مگر صحافت بطور عمومی اطلاع نامہ کے بھی اب تک ان کے یہاں بہت کم استعمال ہو سکی ہے۔

نظام کی حکومت کے زمانہ میں جب کسی کو مستقل جاگیر دی جاتی تو اس پر لکھا جاتا تھا "تا قیام شمس وقمر"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے سابق مسلم حکمرانوں کی نفسیات کیا تھی۔ انگریزوں کی ہندستان میں آمد کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلم نواب نے جو کردار ادا کیا وہ بھی اکثر مورخین کے نزدیک قابل تنقید رہا ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کی ریاستوں میں حیدرآباد جس طرح سب سے بڑی ریاست تھی اسی طرح اس نے تمام ریاستوں میں سب سے زیادہ کام بھی کئے ہیں۔

نواب کے زمانہ میں ریاست کے فنڈ سے ہندو اور مسلم رعایا کو یکساں طور پر امداد دی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح اس دور میں مختلف قسم کے اسلامی کام بھی بہت بڑے پیمانے پر انجام پائے۔ مثلاً شعبۂ امور مذہبی کا قیام، جس کے تحت افراد اور اداروں کو مستقل امداد دی جاتی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے نام سے اردو یونیورسٹی کا قیام، دارالترجمہ جس کے تحت بہت بڑے پیمانے پر دوسری زبانوں کی علمی کتابیں اردو زبان میں منتقل کی گئیں۔ دارالمعارف جس نے کثیر تعداد میں قیمتی عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حیدرآباد کی ان اسلامی خدمات کا اعتراف لوگوں نے دل کھول کر کیا ہے۔ مجھے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ تاہم ایک سوال اب بھی جواب طلب ہے۔ وہ یہ کہ اتنی بڑی بڑی کوششیں مستقبل کے اعتبار سے بے نتیجہ کیوں ہو گئیں۔

اس سوال کا جواب صرف ایک ہے۔ یہ کہ سب کام حقیقتاً قومی کام تھے نہ کہ اسلامی کام۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمام کام اسلام کے نام پر انجام دیے گئے۔ مگر اس سے اصل حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی مسلم قوم جب بھی کوئی کام کرے گی وہ اسلام ہی کے نام پر کرے گی۔ خواہ وہ کام شخصی اور قومی محرکات کے تحت کیوں نہ وجود میں آیا ہو۔

قومی محرک کے تحت کیا ہوا کام خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر انجام پائے کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اگر قومی محرک کے تحت کام کریں تو انہیں یقینی طور پر صرف ایک ہی

انجام کا انتظار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ ان کا کام حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کا مصداق بن کر رہ جائے۔ انہیں ان کی قربانیوں کا کوئی نتیجہ نہ ملے۔

اس کے برعکس حقیقی اسلامی محرک کے تحت کیا ہوا کام ہمیشہ نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اسلامی محرک عین اپنے اندرونی تقاضے کے تحت آدمی کو نتیجہ خیز رخ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً، قدیم حیدرآباد کی اسلامی سرگرمیاں اگر صحیح اسلامی محرک کے تحت ہوتیں تو لازمی طور پر اس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ اس کے عمل کا رخ دعوت الی اللہ اور فکر آخرت کی طرف ہوتا۔ اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جن کا نتیجہ خیز ہونا بالکل یقینی ہے۔ دعوت الی اللہ کا کام اسلام کی توسیع کر کے اس کو مستقل طاقت عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر حیدرآباد میں آخرت پسندی کا ذہن ہوتا تو ”قاسم رضوی“ جیسی تحریکیں کبھی نہ پنپتیں جن کا نقصان اتنا زیادہ ہے کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

۱۹۶۷ میں جب میں حیدرآباد گیا تھا تو وہاں ایک اندوہناک منظر یہ نظر آیا کہ رکشا کھینچنے والے بیشتر مسلمان تھے۔ جہاں تک یاد ہے اس زمانہ میں ۲۵ ہزار رکشا کھینچنے والے تھے جن میں تقریباً بیس ہزار مسلمان تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست کے زمانہ میں مسلمان زیادہ تر ملازمت کرتے تھے۔ جب ریاست ختم ہوئی تو اس کے بہت سے شعبے بھی ختم ہو گئے۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں مسلمان بے روزگار ہو گئے۔ ان میں تعلیم بہت کم تھی، تجارت میں وہ تقریباً نہیں کے برابر تھے۔ اب ان کے لئے جو کام رہ گیا تھا وہ جسمانی محنت کا کام تھا جس میں رکشا چلانا بھی شامل تھا۔

مگر اب پندرہ سال بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب حیدرآباد کے مسلمانوں میں تعلیم بہت بڑھ چکی ہے۔ تجارتوں میں بھی وہ کافی داخل ہو چکے ہیں۔ بہت سے خاندانوں کے افراد خلیجی ممالک میں ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے معاشی نقصان کی تلافی کر لی ہے۔ تاہم یہاں بھی میرے جیسے آدمی کے لئے بہت زیادہ خوشی کا موقع نہیں۔ کیونکہ دوسرے مقامات کی طرح، یہاں کے مسلمانوں کی آمدنی کا بڑا حصہ صرف دو مدوں میں ضائع ہو رہا ہے نمائشی اخراجات اور آپس کے جھگڑے۔

حیدرآباد میں میرا قیام چار دن رہا۔ ان چار دنوں میں عام ملاقاتوں اور گفتگو کے علاوہ جو باضابطہ پروگرام ہوئے، ان کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:

حیدرآباد میں پروگرام کی تفصیل

۱۲ نومبر ۱۹۸۲ مسجد سلیمہ خاتون میں خطاب، قبل نماز جمعہ

پریس کانفرنس، ۳ بجے شام

معززین شہر اور دانش وروں سے خطاب، عزیز باغ، نور خاں بازار

۱۳ نومبر خطاب، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، ناملی اسٹیشن روڈ

خطاب، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ، قدیم باغ عام

علماء کرام سے خطاب، مسجد اعظم پورہ

۱۴ نومبر خطاب، خواجہ کا چلہ (قرآن و سیرت سوسائٹی) مغل پورہ

درس قرآن، مسجد صحیفہ، اعظم پورہ

خطاب، مدینہ ٹکنیکل کالج، نام پلی

خطاب، نرسا پور، حیدرآباد

۱۵ نومبر درس قرآن، مسجد عامرہ، عابد روڈ

خواتین سے خطاب، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ

خطاب، جامع مسجد مشیرآباد

حیدرآباد میں ماہنامہ الرسالہ کے ذریعہ ہمارے مشن کا، کافی تعارف ہو چکا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر واقف ہے۔ چنانچہ مقامی اخبارات میں جب میری آمد کا اعلان کیا گیا تو غیر معمولی طور پر بڑی تعداد میں لوگ میری تقریروں کو سننے کے لئے جمع ہوتے رہے۔ چار دن کی تقریروں میں جو جگہ بھی اجتماع کے لئے مقرر کی گئی وہ کثرت تعداد کی وجہ سے ناکافی ثابت ہوئی۔ دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ حیدرآباد کے تعلیم یافتہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے کسی اجتماع میں دیکھے نہیں گئے۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد وہاں سے جو خطوط ہمارے دفتر کو موصول ہوئے، ان میں سے ایک خط کے چند فقرے یہ ہیں ــــ "مولانا وحید الدین خان صاحب کے حیدرآباد کے حالیہ دورہ کے موقع پر یہاں کے مسلمانوں نے مولانا کو بڑے شوق اور ذوق سے سنا اور بہت پسند کیا۔ لوگوں کے فکر نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ اہل علم اور خواص کا اتنا بڑا مجمع کسی فرد واحد کو سننے کے لئے جمع ہوا ہو۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"

میری تقریروں اور ملاقاتوں کی رپورٹیں مقامی اخبارات میں روزانہ شائع ہوتی رہیں۔ ایک بڑے اخبار کا نمائندہ مستقل طور پر میرے ساتھ تھا تاکہ میری تمام مصروفیات کو "کور" کر سکے۔ لوگوں نے کثرت سے ہمارے مشن کو سنا اور پڑھا۔ چنانچہ چار دن تک یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر اس کا چرچا ہوتا رہا۔

دہلی سے میں اپنے ساتھ کتابوں کا ایک بنڈل (۲۵ کیلو) لے گیا تھا۔ یہ کتابیں پہلے ہی دن ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ٹیلی فون کر کے دہلی سے فوری طور پر مزید دگنا تعداد میں کتابیں منگائی گئیں۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ رات کو دہلی میں الرسالہ کے دفتر کو ٹیلی فون کیا گیا۔ انہوں نے راتوں رات پیک کر کے صبح سویرے کے ہوائی جہاز سے کتابیں روانہ کیں اور ٹیلی فون کے ذریعہ اس کا رسید نمبر ہم کو بتا دیا۔ اس نمبر پر حیدرآباد میں اگلے دن صبح کو کتابیں حاصل کر لی گئیں۔ چنانچہ دوسرے دن اجتماع میں اسٹال پر تمام کتابیں دوبارہ موجود تھیں۔

اب بھی وہی صورت ہوئی جو پچھلے دن پیش آئی تھی۔ یعنی تمام کتابیں "ہاٹ کیک" کی طرح بک گئیں۔ اب رات کے وقت دوبارہ ٹیلی فون کیا گیا اور دوبارہ مذکورہ طریقہ پر دہلی کے دفتر سے کتابیں روانہ کی گئیں۔ اور اگلی صبح کو اسی طرح حیدرآباد کے ہوائی اڈہ پر وصول کر لی گئیں۔ مگر اس بار بھی تمام کتابیں ایک ہی دن میں فروخت ہو گئیں۔ چونکہ لوگوں کا اشتیاق برابر جاری تھا اس لئے اب یہ کیا گیا کہ مقامی طور پر حیدرآباد میں جن لوگوں کے پاس الرسالہ کے پرانے پرچے یا مکتبہ الرسالہ کی چھپی ہوئی کتابوں کے ذخیرے تھے ان کو ان کے گھروں پر جا کر حاصل کیا گیا۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کے اوراق پھٹے ہوئے تھے۔ ٹائٹل پر لوگوں نے اپنا نام وغیرہ لکھ رکھا تھا۔ مگر ان کا بھی یہ حال ہوا کہ جب ان کو اجتماع کے موقع پر اسٹال پر رکھا گیا تو لوگوں نے پوری قیمت پر انہیں خرید لیا۔ مجموعی طور پر ایک سو کیلو وزن سے زیادہ کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

۱۵ نومبر کی شام کو نواب اکبر علی خاں (سابق گورنر یوپی) نے اپنے یہاں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کو جمع کیا۔ اس موقع پر ان لوگوں سے تقریباً ایک گھنٹہ کی ملاقات رہی جناب اکبر علی خاں نے مولانا محمد علی کی زندگی اور کام سے متعلق اپنی ایک کتاب مجھے ہدیہ کی۔ یہ کتاب انہوں نے حال میں شائع کی ہے۔ اس مناسبت سے میں نے اپنی مختصر گفتگو میں بتایا کہ ہمارا مشن کیا ہے، آپ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں محمد علی نے اپنا سفر ختم کیا

تھا وہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا ہے۔

میں نے مولانا محمد علی کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آخر عمر میں مولانا محمد علی اپنی سیاست سے مایوس ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ یورپ جاکر اسلام کی تبلیغ کا کام کریں۔ وہ یقیناً اس کام کے اہل تھے۔ مگر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اپنے ارادہ کی تکمیل سے پہلے وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ میں نے کہا کہ تبلیغ و دعوت کا کام جس کو مولانا محمد علی نے آخر عمر میں کرنا چاہا تھا۔ یہی دراصل کرنے کا اصل کام ہے۔ ہم امت کو اسی خاص کام کے لئے اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لئے ہم نے اسلامی مرکز قائم کیا ہے۔

۱۲ نومبر کو ۳ بجے شام کے وقت حمایت نگر کے ایک ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اردو، انگریزی اور تلگو اخبارات کے نمائندے شریک ہوئے۔ پہلے میں نے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر زیر نظر شمارہ میں الگ سے شائع کی جارہی ہے۔ تقریر کے بعد اخباری نمائندوں نے سوالات کئے جن کے جوابات دئے گئے۔

اگلی صبح کو سب اخبارات میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی۔ لوگوں کے بیان کے مطابق سب سے عمدہ اور جامع رپورٹ روزنامہ آندھرا پربھا (تلگو) کی تھی۔ اس تلگو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر پی این سوامی دوبارہ انٹرویو لینے کے لئے میری قیام گاہ (حمایت نگر) پر آئے۔ انگریزی اخبار (دکن کرانیکل) میں پریس کانفرنس کی جو رپورٹ چھپی تھی اس کی نقل یہاں درج کی جارہی ہے۔

ISLAMIC SCHOLAR IN CITY

Hyderabad, Nov. 13, 1982.

Maulana Wahiduddin Khan, an eminent Islamic scholar, regretted that a powerful 'opinion-building' media like the Press had resorted to sensational news-mongering that was more like an 'inverted pyramid'-where news rested on the smallest sensational part. The Maulana, who is also the Editor of AL-RISALA-a religious monthly magazine - told newsmen yesterday that instead of clashing with the Government, the media should strive for changing the personality of an individual and the society. Such collective efforts would compel Governments to work for the good of its people whether they liked it or not, he declared. He urged people not to resort to revolutions and break traditions. Maulana Wahiduddin Khan is on a four-day mission to the city, propagating the 'true tenets' of Islam. The Islamic method of change, he says is evolutionary rather than revolutionary.

Deccan Chronicle (Hyderabad), Sunday, November 14, 1982.

پریس کانفرنس سے خطاب

(حیدرآباد ۱۲ نومبر ۱۹۸۲)

ہماری یہ پریس کانفرنس معروف معنوں میں کوئی پریس کانفرنس نہیں ہے۔ پریس کانفرنس عام طور پر عوامی اشوز پر ہوتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پاس اس قسم کا کوئی اشو موجود نہیں۔ یہ دراصل ایک قسم کی صحافتی ملاقات ہے۔ اسلامی مرکز کے تعمیری مشن کے تحت ہم ہر طبقہ کے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ہمارے ساتھیوں کو خیال ہوا کہ یہاں کی صحافی برادری تک بھی اسے پہنچایا جائے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحافت گویا عوام کی آنکھ ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ وہ عوام کا دماغ ہے جس سے وہ سوچتے ہیں۔

صحافت ہمارے ملک میں اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں، تاہم اصولی طور پر صحافت موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی قوت ہے۔ مغربی ملکوں میں صحافت کا یہ حال ہے کہ وہ حکومت کے متوازی ایک مستقل قوت بن چکی ہے۔ ان ملکوں میں صحافت اگر کسی صدر حکومت یا وزیر اعظم کی مخالف ہو جائے تو وہ اس کی مخالفت کو نظر انداز کر کے نہیں رہ سکتا۔ مغرب میں صحافت کی قوت کی ایک مثال سابق صدر امریکہ مسٹر رچرڈ نکسن کے سیاسی زوال (۱۹۷۳) کی صورت میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ صحافت کی قوت ابھی تک صحیح رخ پر استعمال نہیں ہو سکی ہے۔ یہ قوت اگرچہ آج پوری طرح انسان کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کو انسان کی اصلاح کے لئے موثر طور پر کام میں نہ لایا جا سکا۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے:

میں جس ہوائی جہاز پر دہلی سے حیدرآباد آیا ہوں، فرض کیجئے کہ وہ اسرائیل یا امریکہ کا جہاز ہوتا اور میں اس کو ہائی جیک کر کے حیدرآباد میں اتارتا اور پھر میری پریس کانفرنس کا اعلان کیا جاتا تو یقیناً موجودہ کانفرنس سے بہت زیادہ بڑی کانفرنس کا منظر یہاں دکھائی دیتا۔ حتی کہ بیرونی ملکوں کے اخباری نمائندے تیزی سے روانہ ہو کر دہلی سے حیدرآباد پہنچتے تاکہ اس کانفرنس کو Cover کر سکیں۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہائی جیکنگ سے زیادہ بے فائدہ کام اور کوئی نہیں۔ مگر آج اسی کا نام صحافت ہے۔ حقیقت کی دنیا میں جو چیز بالکل غیر اہم ہے، وہ پریس کی دنیا میں سب سے زیادہ اہم بن جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے اندر وہ چیز ہے جس کو اخباری اصطلاح میں نیوز ویلو (News Value) کہا جاتا ہے۔

حال میں ایک سفر کے دوران میرا کچھ وقت یوگنڈا کے ہوائی اڈہ انٹیبی پر گزرا ۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ۱۹۷۶ میں فلسطینیوں نے اسرائیل کا ایک ہوائی جہاز ہائی جیک کرکے اتارا تھا۔ چند دن تک یہ واقعہ اخبارات کے صفحہ اوّل کی سرخیوں میں جگہ پاتا رہا۔ اور اس کے بعد فلسطینیوں کو اس کی جو قیمت دینی پڑی وہ آپ سب کو معلوم ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جدید صحافت میں کس طرح ایسا ہو رہا ہے کہ ایک چیز جو حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے قیمت ہو وہ اخبار کے صفحہ میں بہت زیادہ باقیمت بنا کر دکھائی جانے لگے۔

ہم صحافت سے کیا چاہتے ہیں، ایک لفظ میں یہ کہ صحافت حقیقی قیمت (Real Value) کو اہمیت دے نہ کہ اخباری قیمت (News Value) کو۔ ریل ویلو کو اہمیت دینے سے آدمی کے اندر حقیقت پسندی آتی ہے اور حقیقت پسندی تمام انسانی خوبیوں کی اصل ہے۔ اس کے برعکس نیوز ویلو کو اہمیت دینے سے غیر سنجیدگی (Insincerity) پیدا ہوتی ہے۔ اور غیر سنجیدگی بلاشبہ تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔

اسلام جو سنجیدہ اور تعمیری سماج بنانا چاہتا ہے، اس میں صحافت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مگر موجودہ حالت میں صحافت اس مقصد کے بالکل برعکس سمت میں جا رہی ہے۔ اسلام حقیقی چیزوں کو اہمیت دینے والا مزاج بنانا چاہتا ہے اور موجودہ زمانہ میں صحافت کا کمال یہ بن گیا ہے کہ وہ غیر حقیقی چیزوں کو سب سے زیادہ نمایاں کرے۔

ایک سفر میں میری ملاقات کناڈا کے ایک صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہ اسلام کا مطلب کیا ہے۔ میں نے جواب دیا:

Islam means realism

اسلام نام ہے حقیقت پسندی کا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی سائنس ہے اور اس سائنس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ دنیا میں حقیقت پسند بن کر رہو۔ ہر معاملہ میں وہ رویہ اختیار کرو جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔ حقیقت پسندانہ رویہ زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز ہے۔ اور حقیقت پسندی سے انحراف تمام ناکامیوں کا واحد سب سے بڑا سبب ہے۔

موجودہ زمانہ میں دو خاص بڑے بڑے شعبے ہیں۔ جو زندگی کی صورت گری کرتے ہیں: یہ

دونوں شعبے ہیں ـــــ سائنس اور جرنلزم ۔ سائنس کا تعلق زیادہ تر طبیعی دنیا سے ہے اور جرنلزم کا تعلق زیادہ تر انسانی دنیا سے ۔ سائنس اگر کائناتی واقعات کا مطالعہ کرتی ہے تو جرنلزم انسانی واقعات کا۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں میں سخت تضاد ہے ۔

سائنس مکمل طور پر ریلزم (حقیقت پسندی) کے اصول پر قائم ہے ۔ سائنس اس حقیقت واقعہ کو مان کر چلتی ہے کہ ہمارے باہر ایک دنیا ہے جو کامل طور پر خود اپنے محکم قوانین پر قائم ہے ۔ مثلاً پانی کا ایک قانون ہے ۔ خشکی کا ایک قانون ہے ۔ فضا کا ایک قانون ہے ۔ پانی کے قانون سے مطابقت کرنے میں وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کا نام پانی کا جہاز ہے ۔ زمین کے قوانین سے مطابقت کا نتیجہ موٹر کار ہے اور فضا کے قانون سے مطابقت کا نتیجہ ہوائی جہاز ۔ سائنس کی ہر کامیابی دراصل خارجی دنیا سے اسی مطابقتِ کامل کا دوسرا نام ہے ۔

مگر جرنلزم (بالفاظ دیگر انسانی دنیا) میں یہ معاملہ بالکل الٹا ہو جاتا ہے ۔ میں نے جرنلزم پر ایک کتاب پڑھی ۔ اس کے ایک باب میں دکھایا گیا تھا کہ اخبار نویس جب خبر مرتب کرتا ہے تو اس کی ترتیب کے وقت اس کے سامنے کیا اصول ہوتا ہے ۔ اس اصول کو بتانے کے لئے جرنلزم میں ایک خاص اصطلاح ہے جس کا نام ہے (Inverted Pyramid) یعنی الٹا اہرام ۔ مثال کے طور پر شہر میں ایک عمارت بنتی ہے جس کی ۲۱ منزلیں ہیں ۔ اب اخبار نویس اس کی خبر بنائے گا تو اس کی خبر کا پہلا جملہ ہوگا ـــــ ”۲۱ منزلہ عمارت تیار“ ظاہر ہے عمارت کی ۲۱ ویں منزل سب سے آخر میں بنی ۔ پہلے منصوبہ بنایا گیا ۔ پھر زمین تیار کی گئی ۔ بنیاد کھودی گئی ۔ نیچے سے تعمیر کرتے کرتے آخر میں اوپر کی منزل کھڑی ہوئی ۔ مگر اخباری ترتیب میں سب سے پہلے جو چیز دکھائی دی وہ عمارت کی ۲۱ ویں منزل تھی ۔

گویا سائنس میں اگر ریل ویلو (حقیقی قدر) کی اہمیت ہے تو جرنلزم میں نیوز ویلو (اخباری قدر) کی ۔ ہماری زندگی کے دو اہم ترین شعبوں میں اس تضاد نے ہماری زندگی کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے ۔ ہم سائنس میں جس اصول کو اپنا کر کامیابی حاصل کرتے ہیں، زندگی میں اس کے برعکس اصول پر عمل کرتے ہیں ۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنس میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے، زندگی میں ہم وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے ۔ سائنس کے ذریعہ ہم ایک اعلیٰ درجہ کا منصوبہ بند شہر بنا لیتے ہیں مگر اسی شہر کے اندر اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بند زندگی نہیں بنا پاتے ۔ سائنس کے ذریعہ ہم ایسی مشینیں بنا لیتے ہیں جو فنی صحت (Technical Perfection) کی حد تک درست کام کرتی ہیں ۔ مگر انسان کو ایسا نہیں بنا

پاتے کہ وہ ٹکنکل پرفکشن کی حد تک صحیح صحیح اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگے۔

اخبار کے صفحات میں سب سے زیادہ وہی چیز فلیش کرتی ہے جس کے اندر سب سے زیادہ نیوز ویلو ہو۔ سب سے زیادہ کامیاب پریس کانفرنس وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے عوامی اشو پر بلائی گئی ہو۔ ہم اس صورت حال کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ طبیعی علوم کی دنیا میں جو حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے وہی حقیقت پسندانہ نقطہ نظر انسانی دنیا میں بھی اختیار کیا جائے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق قرآن اسی طرز زندگی کا ہدایت نامہ ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو دین ساری کائنات کا دین ہے اسی دین کو انسان بھی اختیار کرے (افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السماوات والارض طوعا وکرھا) قرآن اور کائنات میں وہی نسبت ہے جو سائنس میں تھیوری (نظریہ) اور ڈماسٹریشن (مظاہرہ) کی ہوتی ہے۔ کائنات خدا کے جس دین پر عملاً چل رہی ہے، قرآن اسی دین کا لٹرل اسٹیٹمنٹ (لفظی بیان) ہے۔

قرآن خدا کے وجود کی خبر دیتا ہے اور کائنات اپنی اعلیٰ ڈزائن کے ساتھ تصدیق کرتی ہے کہ یقیناً یہ خبر صحیح ہے۔ قرآن انسان سے کہتا ہے کہ خدا کے آگے جھک جاؤ اور درخت کا سایہ زمین پر پڑ کر اور پتھر پہاڑ کے اوپر سے نیچے گر کر تمثیلی روپ میں کہتا ہے کہ یہی طریقہ صحیح ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ خدا کے حکم کا پابند بنے اور کائنات کی ہر چیز قدرت کے قانون کی مکمل پابندی کر کے اعلان کرتی ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ اس دنیا میں ممکن نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنی تعمیر اس طرح کرو کہ دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور سورج اور چاند اور تمام اجرام سماوی اپنے اپنے مدار میں گھوم کر بتاتے ہیں کہ یہ مطالبہ کس قدر درست ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جہاں آدمی کو اپنے کئے کا انجام پانا ہے۔ اور کائنات اپنی حد درجہ معنویت کے ساتھ گواہی دیتی ہے کہ زندگی کا خاتمہ اسی موجودہ دنیا پر نہیں ہو سکتا، ضروری ہے کہ ایک اور دنیا آئے جہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں اپنی واقعی جگہ پا سکے۔

اسلامی مرکز دہلی کا آغاز ۱۹۷۰ میں ہوا۔ یہ ایک خالص تعمیری مرکز ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اسلام کو زندگی کی سائنس کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ انسان کو بھی اسی حقیقت پسندی کے دین پر قائم کر دے جس حقیقت پسندی کے دین پر ساری کائنات قائم ہے۔ ایک لفظ میں، ہم سائنس کو جرنلزم بنا دینا چاہتے ہیں اور جرنلزم کو سائنس۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن دضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی امین خاں پرنٹر پبلشر مسکول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

October 1983

AL-RISALA

Islamic Monthly

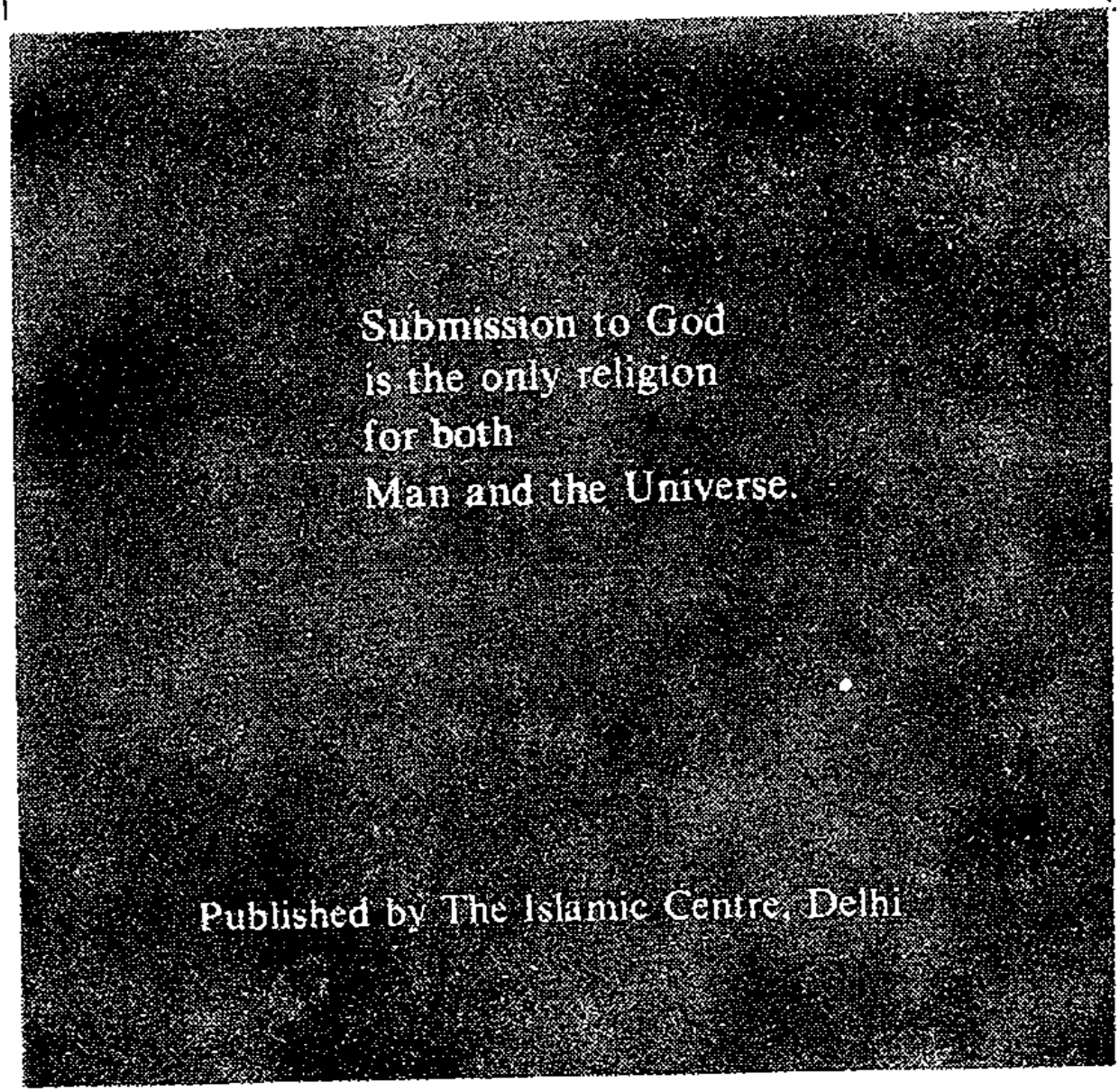

Published by The Islamic Centre, Delhi

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

October 1983
Issue No. 83

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول ہدیہ	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہورِ اسلام	20/-
احیاءِ اسلام	12/-
پیغمبرِ انقلاب	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارفِ اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-
اتحادِ ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقتِ حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ ☐ جمیعۃ بلڈنگ ☐ قاسم جان اسٹریٹ ☐ دہلی ۶